جولائی ۱۹۳۳ء

فاقصص القصص لعلهم یتفکرون

سلسلۂ دارالمصنفین

(۶۶)

حیاتِ شبلی

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

از

سید سلیمان ندوی

فہرست مضامین

حیاتِ شبلیؒ

مقدمہ

۱ - ۵۷

فہرست رجال حواشی

"حیاتِ شبلی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیاتِ شبلی

پیشِ نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں جس نے بتیس برس (سنہ ۱۸۸۲ء سنہ ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا،

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود ۔۔۔ زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است[1]

سوانح کے ذرائعِ علم خاکسار نے اُستادِ مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس (سنہ ۱۹۰۵ء سنہ ۱۹۱۲ء) تک مسلسل گذارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا مگر روح ہمیشہ اُن کے ساتھ رہی، یہ دس برس درحقیقت اُن کی بتیس ۳۲ برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے مصروف ایّام تھے، بلکہ اُن ہی کو اُن کی ستاون ۵۷ برس کی زندگی کا حاصل کہا جا سکتا ہے، خود اُن ہی کا شعر ہے:

ساغرِ زندگیم حیف کہ جز دُرد نداشت ۔۔۔ جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

ان کے اس مصروف ترین حصۂ زندگی کے اکثر لمحات میری نظر کے سامنے گذرے ہیں، اس لئے اس کے مالہٗ و ماعلیہ سے بحدِ بشری مجھے پوری واقفیت ہے، اور اس واقفیت نے اس کتاب کی تالیف میں مدد دی،

[1] مولانا کا شعر ہے، اصل میں زدہ ام ہے،

مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات، اُن کے اعزّہ و احباب اور اُن کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور سُنے، تعلیمی حالات خود مولانا کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنتا رہا، علی گڈھ کے قیام کے واقعات کا بڑا حصہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے اوراق سے بہم پہنچا، اور اُن کی پوری زندگی کا خاکہ اُن کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا،

دانائے راز کارساز کی کارسازی کے قربان کہ راقم الحروف کو مولانا کی زندگی ہی میں ۱۹۰۰ئ میں اُن کے خطوط و مکاتیب کے جمع کرنے کا خیال آیا، اور اُس وقت اُس کا مقصد خطوط کے علمی و ادبی ذخیرہ کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن اُن کی وفات کے بعد اُن کی سوانحعمری کا خیال آیا تو نظر آیا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعہ درحقیقت صاحبِ مکاتیب کے سوانحِ زندگی کے ذخیرہ کو میرے ہاتھوں بلا قصد و ارادہ پہلے ہی سے محفوظ کرا دیا تھا، اسی طرح مولانا کے سوانح کی تالیف، واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی یہ دونوں جلدیں بے حد کارآمد ہوئیں، اور اسی لئے سوانح و واقعات کے ذکر میں مکاتیب کے ہر خط کا حوالہ نمبر اور تاریخ کے تعین کے ساتھ دیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص بہ آسانی واقعہ کی تحقیق کر سکے، اور اس نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حیاتِ شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانحعمری ہے،

بڑی تسکین اس سے ہوئی کہ بحمد اللہ اس وقت ہمارے درمیان مولانا کے ایک حبیب مکرم اور اُن کی زندگی کے اکثر واقعات کے شریک و مشیر و ہمدم، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی موجود ہیں، جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی، اسی طرح مولانا

کے علی گڈہ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیامِ علی گڈہ اور تعلقاتِ سر سید

کے واقعات کی تفتیش کی گئی، اور انھوں نے مہربانی فرماکر کچھ واقعات لکھ کر بھی بھیجے،

مولانا کی زندگی میں اُن کی سوانحعمری کا خیال

میری الہی دیکھئے کہ مولانا کی زندگی میں کبھی یہ وہم بھی نہیں آیا کہ یہ ہستی اسقدر جلد ہمارے درمیان سے اُٹھ جائے گی، اس لئے اُن کے سوانحِ حیات

کے قلم بند کرنے کا خیال بھی نہیں ہوا، البتہ بعض دوسرے لوگوں کو اخیر زمانہ میں ادھر توجہ ہوئی، لیکن اُن کے جواب میں مولانا نے کسی کو اپنے حالات کی مختصر سی کھتونی لکھ کر بھیجدی، اور کسی کو کچھ کہہ کے ٹال دیا، چنانچہ رسالہ ادیب الہ آباد کے اڈیٹر شاکر صاحب میرٹھی نے اپنے رسالہ میں چھاپنے کے لئے کچھ حالات لکھ کر مانگے تو جواب میں لکھا:- "یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھ سکوں، مسلم ریویو میں ایک صاحب نے کچھ واقعات لکھے تھے، وہ آپ لے سکتے ہیں، اس کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ بہ تاکید لکھیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں" (مکاتیب اوّل، مکتوب الیہ نمبر ۳۵)

لیکن نہ مجھے لکھا گیا اور نہ میں نے لکھا،

مسلم ریویو الہ آباد کے جس مضمون کا حوالہ ہے، وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جو انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے، اور مولانا سے شخصی طور پر واقف تھے، یہ مضمون اگست ۱۹۱۲ء کے رسالہ مسلم ریویو الہ آباد میں چھپا تھا، اس مضمون کے لئے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوا دیئے تھے، جو تعلیم و سفر و قیامِ علی گڈہ کے چند سرسری واقعات پر مشتمل ہیں،

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروقی صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات دریافت کئے تو ایک ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم، کچھ قیامِ علی گڈھ اور کچھ اپنی تالیفات و آراء کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا، اور آخر میں شرما کر یہ لکھدیا کہ "خود اپنا آلھا کیا گاؤں۔"

مولانا کی ترتیبِ سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہشمند منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے، شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح انھوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لائف لکھی ہے، (یعنی وہ اس طرح لکھی ہے کہ طرزِ انشاء کے پہچاننے والوں کو وہ بظاہر خود صاحبِ سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں انھوں نے خود مولانا سے خواہش کی مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا، چنانچہ مولانا ابو الکلام کو لکھنؤ سے ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو وہ لکھتے ہیں:- "ہاں اور سنئے! افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھدیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر[۲] خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوائیے، بھئی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی[۳]۔" (مکاتیب ابو الکلام - ۳)

منشی سید افتخار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہیں آئے[۱]

۱؎ یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپا ہے ۲؎ عالم السرائر تو خدا کے سوا کوئی اور نہیں، مگر یہاں مقصود بعض مخفی حالات کا علم ہے، (س) ۳؎ اس فقرہ سے استکبار اور ترفع کا مفہوم نہ سمجھا جائے، مقصود یہ ہے کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو فارسی کا علم رکھتے تھے، گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم مولانا پر لکھنے کے لئے علوم عربیہ اور فنون کلامیہ اور ادب و تاریخ پر اطلاع ضروری تھی، اس لئے مولانا کا خیال تھا کہ وہ انکی سوانحعمری کے فرض سے

چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا، انھوں نے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا:۔ "میری لائف میرے بعد لکھیے گا ورنہ مکمل لائف کیونکر ہوگی"۔ (مکاتیب اوّل مکتوب ایڈیٹر ۲۴)

یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے دس ہی مہینوں کے بعد کاتب کی لائف یعنی زندگی واقعۃً پوری ہو جائے گی، بہرحال منشی صاحب موصوف نے مولانا کے اس جواب کے بعد مجھے گھیرا کہ میں مولانا کے قلم سے اُن کی خواہش کی تکمیل کرا دوں اور اس غرض کے لئے انھوں نے فروری ۱۹۱۴ء میں مجھے پونہ خط لکھا، میں نے مولنا سے انکی سفارش کی تو مجھ جواباً ارشاد ہوا: "افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا"۔ (مکاتیب سلیمان ۶۶)

ہائے ان کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف کیسی پوری ہوئی! سچ مچ میں دنیا کے کاموں سے آخر فارغ ہی ہو کر ادھر متوجہ ہوا،

وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے

راقم نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے مختصر حالات پہلے تو الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اُس زمانہ میں اصح المطابع لکھنؤ میں چھپ کر تمام ہوا تھا بطور دیباچہ کے لکھے، پھر اسی کو معارف اگست ۱۹۱۶ء میں چھاپ دیا، اور مولانا کے مرض الموت کے حالات، وفات اور آخری احوال پر دو تین مسلسل مضمون فروری ۱۹۱۵ء کے زمیندار لاہور میں لکھے، مولانا کے دوسرے قدیم احباب و اعزہ میں سے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء میں، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے دلگداز میں، خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اپنے رسالہ عصر جدید مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء میں، سید فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی نے اپنے رسالہ اُردوئے معلی

میں اور مولنا عبداللہ العمادی نے زمیندار مؤرخہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء میں، اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات، مرثیے اور نوحے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے اور شائع کئے، مگر ان میں استناد کے قابل یہی تین چار اوّل الذکر مضامین ہیں، اور اُس وقت سے لیکر اس وقت تک مولانا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اُس کا ماخذ زیادہ تر پہلا اور کچھ دوسرا اور تیسرا اور چوتھا مضمون ہے،

اُن کی سوانحعمری مستقلاً لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انھوں نے "بشیر پاشا سیر نیا تادہ" کے ضمن میں مولانا کے حال میں ۱۹۲۵ء میں ایک رسالہ "تذکرۂ شمس العلما مولانا شبلی" کے نام سے لکھ کر شائع کیا،

حیات شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام

خاکسار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریک کار مولنا عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہموطنی کا تعلق رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے، ال ال بی، ایم ال اے وکیل اعظم گڈھ کے سپرد کیا گیا، کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو

اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولوی عبد السلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڈہ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون "سیرتِ شبلی" کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا، اس کے بعد وہ اسمبلی کی ممبری اور اس کے سیاسی فرائض میں ایسے الجھے کہ اس سیرتِ شبلی کے مسودہ کو تمام کرنے کے لئے وہ مناسب وقت و فرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے

اس لیت و لعل میں سالہا سال گذر گئے، اس اثناء میں مولانا کے بہت سے احباب اور ان کے سوانح کے مطالعہ کے مشتاق اسی اشتیاق میں چل بسے، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آگیا، یعنی مولانا کی وفات اور دار المصنفین کی بنیاد پر پچیس چھبیس برس گذر گئے، احباب کا تقاضا ہوا کہ دار المصنفین کی پچیس برس کی سلور جوبلی منائی جائے، میرا اصول یہ ہے کہ

نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست

اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوعِ جوبلی یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دیدیا جائے جو سالہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا، آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۲ء میں یہ انجام کو پہنچا، اور اسی زمانہ میں اس کی چھپائی بھی شروع ہو گئی، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس طرح صاحبِ سوانح کی وفات ۱۹۱۴ء والی یورپ کی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی اُن کی یہ سوانح عمری کی تالیف بھی ۱۹۴۰ء والی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی، جس سے زیادہ تعداد میں کاغذ کے ملنے کی دقت ایسی ضخیم کتاب کی چھپائی میں ہارج ہوتی رہی، اور آخر کسی

بکسی شکل سے یہ مشکل حل ہوئی، اور چھپنے کی صورت نکلی،

معاونوں کا شکریہ میں آخر میں اپنے اُن تمام بزرگوں اور دوستوں کا مشکور ہوں جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں مجھے مدد دی، بالخصوص مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا جن کے مجموعہ اوراق کے سبب سے مکاتیب کی ورق گردانی اور کاغذات اور مسودات کی تلاش کی مصیبت سے بہت کچھ نجات ملی، اور مولوی اقبال احمد سہیل صاحب کا جن کی تحریر سے اعظم گڈہ کے بعض علمی واقعات اور مولٰنا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں بڑی مدد ملی، اس کے بعد محبی منشی محمد امین صاحب زبیری کا جو علی گڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں نظمیں اور واقعات نقل کر کر کے مجھے بھیجتے رہے،

سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ کے ان آٹھ سو صفحوں کو بڑی محنت سے حرف حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ کچھ بڑھایا، اور اس طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے گویا توثیق کی، فللہ الحمد،

حیات شبلی کے معتقد و منتقد خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانحعمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اُس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ اُلجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے، اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے

تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں، اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہیں، کیونکہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے اُن ہی پر پڑتی ہیں، اور اُن کے تکرار و اعادہ میں اُن کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں،

فعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ　　ولکنّ عین السخط تبدی المساویا

رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے،

بہر حال شبلی، شبلی تھے، جنید و شبلی نہ تھے،

عہدِ جدید کا عالمِ اوّل مولانا کا رنگ ان قدیم علماے دین کا نہ تھا جن کا پاک مشغلہ صرف خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور مدرسوں میں درس و تدریس ہے، اگر ایسا ہوتا تو ایسے بزرگوں کے تذکروں کے لکھنے کا جو پرانا دستور چلا آتا ہے تذکرہ نگار کو اس سیدھے رستہ پر چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی، بلکہ یہ عہد جدید کے سب سے پہلے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں جن میں قدیم کے ساتھ ایسے جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں جو عہد قدیم کی مانوس نگاہوں میں کبھی کبھی کھٹک پیدا کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی، اس لئے وہ قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے مرج البحرین یلتقیان، اور اسی لئے اُن کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علماے دین کے کارناموں

سے نسبتہً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید علوم کے بہت سے آراء و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محققِ فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہرِ تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانہ کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے، اور یہ سب گوناگوں رنگ اُن کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں، جن کی تفصیل ان اوراق میں نظر آئے گی،

کتاب کے ضمنی مباحث اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحعمری نہیں، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضرور تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے، جس میں دیارِ مشرق میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہی جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے،

تصویر رسمِ زمانہ کے مطابق عام لوگوں کو اس میں صاحبِ سوانح کی عکسی تصویر بھی ضروری معلوم ہوتی ہوگی، مگر لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے اُن کی جو سچی اور اصلی تصویر اس پوری کتاب میں نظر آتی ہے، وہ اس فریب نظر والے گناہِ بے لذت رسمی تصویر سے زیادہ پائدار اور زیادہ قیمتی ہے، البتہ اس کی کوشش ہے کہ ان کی جسمانی فانی تصویر کے بجائے ان کے باقیات

صالحات کاموں کی تصویر سے ان اوراق کو مزیّن کیا جائے، یعنی ان عمارتوں کی تصویریں دیدی جائیں جن میں ان کے اعمالِ صالحہ اور صدقاتِ جاریہ مجسم ہیں،

کتاب کا نام کتاب کا نام بھی خود صاحب سوانح کا فیضِ انتخاب ہے، مولانا ابوالکلام کے نام والے اوپر کے خط میں "حیاتِ شبلی" خود ان کے قلم سے نکلا ہے، اور پسند کے قابل ہے،

محسن کی شکرگذاری اس حیاتِ شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح استاد مرحوم کے احسانات کے بار سے میں سبکدوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی، کیونکہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، اور اُن کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہی ہے، سب سے اوّل یہ کہ انھوں نے اس بے مایہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استطاعت کے بموجب دین وملت کی کوئی خدمت بجا لا سکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو طالب علم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دستگیری فرمائی کہ حصولِ علم اور شوقِ مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا، اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سُن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم وفن کے آستانہ پر لا کر کھڑا کر دیا، اور سب سے آخر یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سیدِ اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اوّل پہنچایا، یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مطالعہ، جمع وتنقید اور تالیف وتحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی، جو الحمدللہ یہاں اُس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے،

اور انشاء اللہ وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار لغزشوں کے باوجود حجاز کے بجائے ترکستان جانے کی غلطی اُس سے سرزد نہیں ہوئی، اور ساری علمی و عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اسی سایۂ رحمت ؐ کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا، اور اس طرح سرکار ؐ مدینہ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہِ قبول کے قابل ٹھہرا، اور تلافیِ مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا، ع

حلِ ایں نکتہ ہم از روئے نگار آخر شُد

ہیچمدان سُلیمانؔ

۲۵ر محرم ۱۳۶۲ھ

۲ر فروری ۱۹۴۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حیاتِ شبلی

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے، لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس کے لئے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرکے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے،

دادِ او را قابلیت شرط نیست　　　بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

ہر مسلمان سپاہی جنید و شبلی نہیں ہوتا، لیکن اُس کا یہی ایک کام کہ خدا کی راہ میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنت کا دروازہ اس کے لئے فوراً کھل جاتا ہے،

پچھلی صدیوں میں جو کچھ پیش آیا اور ہر دور میں اسلام کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت اور وقت کی دینی ضرورت کے مطابق اشخاص جس طرح پیدا ہوتے رہے، اُن کے حالات تاریخ کے صفحوں میں مذکور ہیں، خود ہندوستان میں دیکھئے کہ گو آلِ تیمور سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے فائدے پہنچے، مگر ان کے بعض فرمانرواؤں کی کوتہ اندیشی سے دو رخنے بھی پیدا ہو گئے، ایک یہ کہ ایرانی امراء کو سلطنت میں اقتدار حاصل ہو گیا، اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اُن کی بہت سی مذہبی رسموں کو علی الاعلان قبول کر لیا گیا، آخر ان ہی دونوں رخنوں سے وہ سیلاب آیا جس نے ان کو بھی ڈبو دیا اور اسلام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کر دینا چاہا، عین اُس وقت سرہند و دہلی کے دو خانوادوں سے وہ اشخاص پیدا ہوئے، جنھوں نے ان فتنوں کے منہ بند کئے اور اسلام کے قلعہ کو اس سرزمین میں از سرِ نو محفوظ کیا، تیموریوں کا دور جب ختم ہوا، اور سکھوں نے سر اُٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خاندانوں سے وہ اکابر اُٹھے، جنھوں نے پورے ہندوستان کو جگا دیا، اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغِ دین کا ولولہ پیدا کر دیا،

انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ رؤیں پر حملے شروع کر دیئے

دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر ان پر حملہ کی جرأت پائی، اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدانے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے، جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑادیئے، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تورد عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں، اور کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف، اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل، اور عبرانی ویونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا،

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان تھا، اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں،

یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانینِ فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کئے، ان کا اصلی جواب تو وہ علما دے سکتے تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح جو قدیم فلسفہ میں ماہر تھے، اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف ہوتے، مگر بہر حال مالا یدرك كله لا يترك كله، کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق اُن ہی لوگوں میں سے جو گو نیم عالم تھے، لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے، سر سید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا، اور ان سے بہتوں کو ایک معنی کر فائدہ بھی پہنچا، لیکن چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں، اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بہ مراحل دور تھیں، ان کی غلطیوں کا سبب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے زمانہ کی طبیعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی مان کر مسائلِ شرعیہ کو اُن کے مطابق کرنے لگے، اور یہ وہی غلطی تھی جس میں بہ مقابلۂ فلسفۂ یونان تیسری اور چوتھی صدی میں باطنیہ فرقہ کے علما، اور مصنفین مبتلا ہو چکے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ علماؤ فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں وہی انبیا، اور رسل علیہم السلام کہتے ہیں، اس لئے دونوں میں ایسی تطبیق دی جائے کہ انبیاؑ کا کلام کسی نہ کسی تاویل سے حکماؤ فلاسفہ کے خیال کے مطابق ہو جائے، لیکن متکلمین اہلِ سنّت نے یہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ

یہ کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا اُس کو قطعی ویقینی مان کر حکما و فلاسفہ کے ان مسائل کی جو قطعاً مخالف تھے، دلائل سے غلطی ثابت کی، اور جو کسی قدر تصحیح سے صحیح ہو سکتے تھے، اس کی تاویل کر دی، اور جو تمام تر مطابق تھے یا کم از کم مخالف نہ تھے، یا انبیاء علیہم السلام نے اُن سے نفیاً یا اثباتاً بحث ہی نہیں کی تھی، ان کی توثیق کی،

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے،

مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیتِ خاص رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لئے اٹھے وہ اَن پڑھ مشنریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب اُن کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و تمدّن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخی و تمدّنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سرِ نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو، اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات

کی بے مائگی کا بھی اندازہ ہو،

مرحوم کا مقصدِ زندگی اگر یہیں تک ختم ہو جاتا تو بھی کام نسبتہً ہلکا ہوتا، مگر اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اور اُن ہی کی تفصیل اس کتاب کی غرض وغایت ہے،

اس دوسری غرض کے لئے اُنھوں نے ایسے پر زور مضامین لکھے اور تقریریں کیں جن سے یہ ثابت ہو کہ ہماری عربی تعلیم کا پرانا نصاب اصلاح کا محتاج ہے، اور ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہئے، شروع شروع میں ہر نئی تحریک کی طرح اسکی بھی مخالفت کی گئی، اور شدید مخالفت کی گئی، مگر جب لکھنؤ میں دارالعلوم کی بنیاد ڈال دیگئی اور اس کے نتائج سامنے آئے تو رفتہ رفتہ مخالفت کی آواز دھیمی پڑتی گئی، اور مولانا اور مولانا کے تلامذہ کے ہاتھوں حیدرآباد سے بھاول پور تک اور خاص طور سے صوبہ ہائے متحدہ اور بہار کے مدرسوں اور ڈھاکہ اور حیدرآباد کے مشرقی و دینی شعبوں میں عظیم الشان اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، یہاں تک کہ اب صوبۂ متحدہ کی مقدس مذہبی درسگاہوں تک اُس کے اثرات پہنچ رہے ہیں،

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء کے وجود سے پہلے ہی اس کے متعلق سب سے پہلی آواز سفرنامۂ روم و مصر و شام میں ۱۸۹۲ء ۱۳۰۹ھ میں اٹھائی تھی، اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے

مذہبی مدرسوں اور خاص طور سے **جامع ازہر** کے نصاب و طریقِ تعلیم و تربیت پر بڑی دلسوزی
سے افسوس و حسرت کے آنسو گرائے، آنسو کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے، اسی کے چند سال بعد
۱۸۹۹ء میں **جامع ازہر** کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی، اس کے متعلق سیّد رشید رضا
اڈیٹر المنار مصر نے مسلسل مضامین لکھے، ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کے المنار میں اپنی اصلاحی
تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نامور علماء کے نام سنداً پیش کئے وہ یہ تھے
شیخ احمد جان روسی، شیخ شنقیطی مغربی (مراکش) اور شیخ شبلی نعمانی ہندی[1]، اس کے بعد اگر
۱۹۱۴ء کی تحریک جامعۂ مدنیہ کی کامیاب ہوجاتی تو اصلاحِ مدارس کی یہ تحریک ساری
دنیائے اسلام میں پھیل جاتی، مولانا اس ماحول میں جس کو ہندوستان میں تعلیم جدید نے پیدا
کیا تھا ۱۶ برس کے قریب رہے تھے، اُن کو خوب معلوم ہوچکا تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ
کس رُخ پر ہے، اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم و فنون کا کیا حال ہوگا، اور جو شکوک و
شبہات اس تعلیم کی بدولت پیدا ہو رہے ہیں، اُن کے جواب دینے کے لئے کس استعداد
کے علما کی ضرورت ہے، ساتھ ہی مصر و شام و ترکی کی سیاحت نے علماء کے جدید فرائض
کی ضرورتوں کو اُن پر آئینہ کردیا تھا، اور ان ہی وجوہ سے ان کو اپنی تحریک کی ضرورت کا
وہ شدید احساس تھا جو دوسرے علما کو نہ تھا،

اس اصلاحی تحریک کی دو دفعات پر مولانا کو بہ شدت اصرار تھا، ایک یہ کہ قدیم
یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں، دوسری یہ کہ علما، تعلیم
یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقینِ یورپ کے اعتراضات کے جواب اور

[1] اخبار البشیر ۱۰، ۱۰ ستمبر ۱۸۹۹ء

غلطیوں کی اصلاح کے لئے انگریزی پڑھیں، اس سلسلہ میں دو واقعے مجھے یاد آئے، ایک دفعہ تنہائی تھی تو خاکسار نے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ و منطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے، فرمایا: یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علمار کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علماے اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا، اور اب اُن سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علما، ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں، اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں،

مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دارالعلوم کے تمام طلبہ کے لئے انگریزی لازمی کیجائے اتفاق نہ تھا، چنانچہ ایک دن موقع پا کر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسہ میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انھوں نے ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمایا دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہو گی

اب بھی دیکھو جب مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے، تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں ہے،

یہ خیالات ان کے بیسیوں مضامین اور متعدد تقریروں میں بار بار دہرائے گئے ہیں، اور عباسیہ کے زمانہ میں علوم یونانی کی اشاعت اور علم کلام کی ایجاد سے اس کی اصلاح کی مثال برابر اُن کے سامنے رہی، ایک تقریر میں وہ پوری تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

علماء کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہئے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں، اور اُن کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیونکہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے، تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے، جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے، صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذاتِ خود حاصل نہ کریں، ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں، جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں، اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔" (خطباتِ شبلی ص۹)

اسی خیال کے بموجب انھوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کئے، اور الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام

اور الکلام میں اُن کو ترتیب دیا، مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جدید علوم و مسائل سے اُن کی واقفیت بھی محض سُنی سُنائی ہی تھی، یا ثانوی درجہ کی تھی، اس لئے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کر سکے جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی، دوسری کمی یہ ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین و حکماے اسلام کی کتابوں سے چُن کر یکجا کیا، حالانکہ ان کا اصلی سرچشمہ کتابِ الٰہی اور سنّتِ نبوی تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہِ راست سامنے رکھی جاتیں، تو منزلِ مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ نے یہ نقطۂ نظر ان کے سامنے کر دیا تھا مگر تصنیفی عمل کا وقت گذر چکا تھا، البتہ سیرتِ نبویؐ کی تکمیل کا موقع اُن کو ملتا تو ضرور وہ اسکی تلافی کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے کہ امام غزالی وغیرہ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی تراجم کو براہِ راست درس میں داخل نہیں کیا، بلکہ ان علوم کو پڑھ کر انھوں نے خود یا دوسرے مسلمانوں نے ان علوم پر اپنی اسلامی طرز پر جو کتابیں لکھیں اُن کو علما کے درس میں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان علوم کو خود مسلمان بنایا، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا، مولانا کے سامنے بھی جیسا کہ اوپر کی تقریر میں ہے، یہی چیز تھی، مگر افسوس کہ اس پر عمل اب تک اس لئے نہ ہو سکا کہ ان علوم کو علما اب تک حاصل نہ کر سکے، اور ان پر ان کی تصنیفات کا زمانہ تو یہ مراحل دور ہے، تاہم جو اصل نکتہ ہے، وہ یہی ہے کہ پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہئے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہئے، ورنہ بغیر اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی جو امام غزالی سے پہلے پھیلی تھی، بلکہ میں

کہتا ہوں کہ مختلف تحریکوں اور تصنیفوں کے ضمن میں وہ پھیل بھی رہی ہے،

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہوگیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہانتک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جزء اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درسگاہوں میں اُن ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کرکے دکھانا ضروری قرار دیا گیا، اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقابلہ میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے، اور اہلِ یورپ کے کارناموں کے سامنے اُن کو اپنے مذہبی و تمدنی و سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں، اور اس طرح اُن کا مذہب جو اُن کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لئے مردہ ہو جائے،

اس کام کے لئے سب سے پہلے انھوں نے خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی ذاتِ پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا، اس کے بعد خلفاے راشدینؓ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلاطینِ اسلام رحمہم اللہ کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لئے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی، اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور

کالجوں میں زیرِ درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے، تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے، اس طرح مسلمانوں کو طرح طرح کے علمی و سیاسی فریبوں سے خود اسلام سے برگشتہ کردیا

چونکہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر، تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اس لئے اُن کے تاریک پہلوؤں کو دکھائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بنا پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو بُرا کہنا اور بُرا دکھانا ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہوگیا تھا،

ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہوچکا تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے، جو اُس زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے، ان کے بعد صوبہ یوپی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے، اور لوگ اسی طرح آتے رہے، انگلستان میں بھی یہ کام عمدگی سے انجام پا رہا تھا، اور انگلستان کے سوا فرانس اور جرمنی میں جن کو مشرق کی شہنشاہی کا دعویٰ تھا، یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا، ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کرنر، برتھالمی سینٹ ہلیر، نولڈیکی، ولہاؤسن، گولڈزیہر، رینان وغیرہ یورپ کے فضلا باری باری سے اس کام کو انجام دیتے رہے، اور سب سے آخر میں انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب اُٹھے، یہاں تک مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی انکی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جن میں سب سے زیادہ بدنام الہلال مصر کا اڈیٹر جرجی زیدان ہے، یہ لوگ مشنری نہ تھے، اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے، بلکہ اُن کا شمار یورپ کے

فضلا میں تھا، یہ اپنے اغراضِ فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھالیا کرتے تھے اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے، اور اس کے لئے سچ یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش اور جستجو کرتے تھے، محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد ڈالتے تھے، اور اب بھی وہ اپنے ان کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں،

ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لئے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلیؒ ہی تھے جنھوں نے ان ہی کے طریقے سے اُن ہی کے اسلوب پر اُن کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدّن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی،

اس سلسلہ کا آغاز مولانا نے اپنی "گذشتہ تعلیم" سے کیا، جس میں دکھایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی دے کر دوسری قوموں کی زبانوں سے کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ اور دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع درسگاہوں کو قائم کرکے دنیا کی ترقی میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے، پھر آگے چل کر معلومات کے اضافہ کے بعد اس مضمون کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کردیا،

مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز پروپگنڈا جزیہ کے نام سے جاری کیا جاتا تھا، یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت

میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس مذہبی ٹیکس کے ادا کئے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہا نے یہی لکھا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کئے جانے کا معاوضہ ہے، جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک اُن مسلمان قوموں کا نہ تھا جن کو ہندوستان کی فرمانروائی نصیب ہوئی، مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نُصرت کا معاوضہ ہے، یعنی اسلامی ملکوں میں اُن غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، کہ وہ انکی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا، تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کریں، اسی لئے جب خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں نے اُن کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ کردئے گئے ہیں، مولانا کا یہ مضمون شائع ہوا تو لوگوں کو اُن کی اس اچھوتی تحقیق پر حیرت ہوگئی، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ مولانا کی یہ تنہا تحقیق ہی ان کے نزدیک اُن کے کارنامۂ فضیلت کے لئے کافی تھی، مولانا کا تمامتر استدلال کتبِ فتوح و تاریخ سے تھا، اس لئے ممکن ہو کہ بعض لوگوں کو اس کے ماننے میں اب بھی تامل ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاے اسلام رحمہم اللہ کو اس بارہ میں مختلف ہیں کہ جزیہ بقاء علی الکفر یعنی غیر مسلم ہونے کا معاوضہ ہو (ہدایہ) قتل کا بدل ہے یا قتال کا (فتاویٰ سراجی و فتح القدیر) یا

اس بات کا کہ ان کو اسلامی ملک میں سکونت کی اجازت دی گئی ہو، (مبسوط ص ۸۰ ج ۱۰)

تاہم وہ ائمہ جن کی نظر جزیہ کے ساتھ اہلِ ذمہ کے شرائطِ مصالحت اور اس کے مصارف پر ہے اُنھوں نے صاف تصریح کردی ہے کہ یہ فوجی خدمت سے استثنا کا معاوضہ ہو،

پانچویں صدی کے فقہ حنفی کے مشہور امام سرخسی المتوفی سنہ ۴۹۰ھ مبسوط میں معترض کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر جزیہ کفر کا معاوضہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دنیا کے چند خزف ریزوں کو لے کر کفر کی بقا کو انگیز کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:-

ثم یاخذ المسلمون الجزیۃ منہ	پھر مسلمان ان ذمیوں سے اون کی اوس ذاتی جسمانی امداد
خلفاً عن النصرۃ التی فاتت باصرارہ	کے معاوضہ میں جس کے یہ ذمی اپنے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے
علی الکفر، لان من ہو من اہل	اہل نہیں ہیں جزیہ لیتے ہیں، اسلئے کہ دارالاسلام کی مدافعت و
دارالاسلام فعلیہ القیام بنصرۃ	مدد اس کے سب رہنے والوں پر یکساں واجب تھی، اور چونکہ
الدار، والابد انہم لا تصلح لھذہ	ذمی جسمانی امداد کے قابل نہیں کیونکہ وہ دل میں دشمنوں کی
النصرۃ، لانھم یمیلون الی اہل	طرف طبعاً مائل ہیں، تو اگر انکو اسلامی فوج میں داخل کر لیا جائے
الدار المعادیۃ فیتشوشون علینا	تو وہ دشمنوں کو مدد پہنچائینگے اسلئے ان سے جسمانی مدد کے بدلہ مالی مدد
اہل الحرب، فیوخذ منہم المال	لیجاتی ہو تاکہ وہ انکی امدادی رقم مسلمان غازیوں پر صرف کیجائے
لیصرف الی الغزاۃ الذین یقومون	جو دارالاسلام کی طرف سے لڑرہے ہیں، اور اسی لئے ان ذمیوں
بنصرۃ الدار، ولھذا یختلف	سے انکی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کے سبب سے ان کے جزیوں
باختلاف حالہ فی الغنی والفقر،	کی رقم بھی کم وبیش رکھی گئی ہو، کیونکہ امداد کرنے والوں

فانه معتبر باصل النصرة، والفقير لو كان مسلماً كان ينصر الدار راجلاً ووسط الحال كان ينصر الدار راكباً والفائق في الغنى يركب ويركب غلاماً فما كان خلفاً عن النصرة يتفاوت بتفاوت الحال ايضاً، (مبسوط سرخسي جلد ۱۰ ص ۸۰ مصر)

بھی اس حیثیت کی کمی بیشی کا اعتبار رکھا گیا ہی کیونکہ اگر مسلمان نادار ہو تو وہ صرف اپنی ذات سے پیادہ لڑائی کو تیار ہوگا، اور متوسط الحال مسلمان گھوڑے پر سوار ہوکر نکلیگا اور دولتمند مسلمان خود بھی سواری پر جائے گا اور اپنے ساتھ غلام کو بھی ایسا سوار کرکے لیجائیگا، انہی حالات کے مساوی ذمیون سے بھی جزیہ کی رقم بتفاوت حال وصول کیجائیگی یعنی جس طبقہ کا مسلمان سپاہی غازی اپنے اوپر خرچ کریگا اُس طبقہ کے ذمی سے اسکے مطابق جزیہ لیا جائیگا!

اسی اعتراض وجواب کو سید محمود آلوسی مفتی بغداد اپنی مشہور ومقبول تفسیر روح المعانی میں نقل کرکے کہتے ہیں،:

وقد يجاب بانها بدل عن النصرة للمقاتلة منا وبهذا اتفاوت لان كل من كان من اهل دار الاسلام يجب عليه النصرة للدار بالنفس والمال وحيث ان الكافر لا يصلح لها لميله الى دار الحرب اعتقاداً اقيمت الجزية الماخوذة المصروفة الى الغزاة مقامها، (جلد عاشر ص)

اور اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ یہ جزیہ ہمارے (مسلمان) سپاہیون کی جسمانی وذاتی امداد کا مالی معاوضہ ہے، اور اسی سے اس کی مقدار حیثیت مالی کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہی، کیونکہ دارالاسلام مین سب رہنے والون پر دارالاسلام کی امداد جان ومال سے ضروری ہی، اور اسکے بجائے غیر مسلم سے اس لئے کہ وہ طبعًا دارالحرب والون کی طرف اعتقاداً میلان رکھتا ہی، جزیہ (مالی معاوضہ) لیا جاتا ہی جو ان مسلمان سپاہیون پر خرچ کیا جاتا ہی،

علماے احناف کا یہی مسلک ہی، چنانچہ ہدایہ کتاب الجزیہ اور اس کی شرح فتح القدیر میں یہ مسائل مذکور ہیں، اس باب میں مولانا کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے امام سرخسی کے نظریہ کی تائید میں مغازی و فتوح کی کتابوں سے تائیدی واقعات یکجا کر دیئے جس نے نظریہ کو فقہ کا ناقابلِ تردید مسئلہ بنا دیا، مخالفینِ اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوقِ زندگی بھی حاصل نہیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں آرمینیا کا واقعہ پیش آیا، یعنی ٹرکی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو جب بزور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحابِ قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے، اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا، اس موقع پر مولانا نے آرمینیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور "حقوق الذمیین" لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں، بلکہ اُسکی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پرِ پرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے،

اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں، اور اس وقت سے برابر عیسائی اہلِ قلم اس کے جواب میں مصروف ہیں اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے ایس ٹرٹین (سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی) کی کتاب "غیر مسلم رعایا مسلمان خلفا کے زیر حکومت" (The Caliphs and Their non-moslem Subjects) (سنہ ۱۹۳۰ء) ہی

عیسائی یورپ نے خلفاے راشدین اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے خلاف ایک بہت بڑا الزام یہ قائم کیا تھا کہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جو دنیا

کی صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، جلا کر خاک کر دیا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام علم کا دشمن ہے، گو اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ ہر خرافات کا مجموعہ علمی خزانہ ہونے کا مستحق کہاں تک ہو سکتا ہے، تاہم مولانا شبلی آگے بڑھے اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزام مسلمانوں پر سراسر غلط ہے، بلکہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اسکو برباد کر دیا تھا، یہ تحقیق بھی بہت مقبول ہوئی، اور اس کے بعد خود یورپین محقق مصنفوں نے اس الزام کی تردید کی ہے، شام کے جرجی زیدان نے مولانا کے مضمون کا جواب لکھا تو اللہ تعالیٰ نے راقم آثم کو توفیق بخشی کہ اس کا جواب لکھے، چنانچہ وہ الندوہ میں شائع ہوا،

اسی جرجی زیدان نے قبۂ اسلام میں بیٹھ کر تمدنِ اسلامی کے نام سے متعدد جلدوں میں اسلامی عربی تمدن کی تاریخ لکھی اور اس میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بظاہر عرب خلفاء کے محاسن اور درحقیقت اُن کے معائب کا دفتر تیار کیا کہ نادان مسلمان اس کے شکر گذار ہوں، لیکن دانا دشمنوں نے اس کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس کی یہ قدردانی کی کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسلمان طالبعلموں کے سامنے اس زہر آلود خوانِ کرم کو رکھنا طے ہوا، اُس وقت ساری دنیاے اسلام اور علماے اعلام میں سے مولانا ہی کا قلم نیام سے نکلا اور مصنف کے سارے اعتراضات کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھدیا، ان کی یہ خدمت ایسی قیمتی ثابت ہوئی کہ مصر کے علماء نے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالتِ مرتبت کا اعتراف کیا،

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوؤں

پر عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آگیا، اور پھر ہندوؤں میں جدوناتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہوگئے، جنھوں نے عالمگیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا ہی کا قلم تھا جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیئے، یہ اب تک اس باب میں بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو پوری آب و تاب سے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے جمع کیا، اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتبخانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہانگیری وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے اور ایک حد تک سچ بھی ہے کہ یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام تر نمایندے نہ تھے، اس لئے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی،

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تلاش و محنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انھوں نے دنیا

کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہو تو پیش کرے،

آجکل کی سیاسی و اقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ اُن کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے؛ الفاروق سے! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ اُن کی دوربین نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کر لیا تھا

الفاروق کی نسبت یہ کہنا صحیح ہے، کہ اس میں حضرتِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمداللہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنّف نے صرف اُس گوشہ کو اُجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اور جس کی ضرورت اُن کے عہد میں بہت شدید تھی چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا، اسی طرح اُس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جزئی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے، والعصمۃ للہ وحدہٗ،

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرداز یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس وسعتِ نظر، جستجو، اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں، مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، جن کی مدح وستائش کا اعتراف خود یورپ کے

مستشرقین نے علی الاعلان کیا، اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست و بازو نے اس کو علی حالہٖ بلند رکھا اور اس کے لئے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں،

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآنِ پاک کو محرّف ثابت کرسکیں، اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انھوں نے وفات پائی ہے، اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآنِ پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے، جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹکل لکھا اور بڑے دعوے سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لئے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا، اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا،

اُس زمانہ میں علما جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی میں یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڈھ سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے صرف ایک رسالہ "قرأت فاتحہ خلف الامام" کے رد میں اُردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علمائے کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کردیں اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولنا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی و حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی و حضرت مولنا

اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اُردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی، اور اُس زبان کو جس کی نسبت بطور معذرت سیّرالنعمان میں یوں فرماتے ہیں، ع حرف بہ اُردو زدن آئین نہ بود"، اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علماے زمانہ کے لئے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا، اور بیشمار کتابیں اُن کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھکر یہ کہ اس ہی بعض علماے اعلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت وافادت اور مضامین کی بلندی وندرت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، مگر بیان کے اشکال، تعبیر کی دقّت، علمی وفنّی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرز بیان کے تتبع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لئے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہہ واستعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ اُن کی کتابیں ادب وانشا کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں، اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا، اور اب تو وہ علمی ومذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے،

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجئے، اُس وقت تک حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے، وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے تصوف و فقہ کے اختلافی مسائل کی تحقیق یا فرقِ باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، تاریخی، فقہی، تمدّنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوعِ سخن میں وہ گلباری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پُربہار ہو گئی، اور

اب اس کی تقلید میں علماء کی تحریریں اور تالیفیں بحمداللہ کہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں
اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا اور اُس وقت کا علم کلام گویا یہی طرزِ سخنوری تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لئے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی ساری عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گذر گئی، اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے حنفی اور اہلِ حدیث، سنّی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائی، مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی تالیفات پہ نظر ڈالئے، بقول اُنھی کے

گرچہ سرو برگِ سخن دیگر است　　　　شمع ہمان است ولگن دیگر است

انھوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل کے لئے زمانہ کے مطابق ایک اور دلنشین شکل پیدا کردی، اُن کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہلِ حدیث کا مناظرہ نہیں؟ اُن کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ وسنّی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی و تاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل و قال کا طریق، حریفانہ تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن و طنز، سوء تعبیر اور ناسزا سبّ و شتم سے اتنا بدنما ہوگیا تھا کہ اس نے تاثیر و تاثر اور قبولِ حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر سے کھودی تھی حالانکہ احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل ہمیشہ سے اہلِ حق کا شیوہ رہا ہے، اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لئے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں بلکہ

جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رد الزام اور ردِ جواب کے بجائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دلنشین، دلچسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں اور اُن سے بڑا فیض پہنچا، اور علمائے بھی اس پرواز پر کتابیں لکھنی شروع کر دیں، جو مفید حال ہیں،

مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھاگئی تھی کہ اُن کی نظر درسی کتابوں اور اُن کے شروح وحواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا کسی اور علم وفن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انھوں نے ہر علم وفن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتبخانے چھانے، دنیا کے گوشہ گوشہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا، اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں اُن کے حوالے دیئے، نصاب تعلیم میں اُن میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علما کو اُن کے مطالعہ کی ترغیب دی، اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، ندوہ کے ایک اجلاس میں علماؑ کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ تو مسلمانوں

کے علوم و فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جانفشانیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علما جو ان علوم کے اصل وارث تھے ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائیکہ ان کی تلاش و تصحیح و مطالعہ و اشاعت کی زحمت اٹھائیں، مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علما میں ناکام نہیں رہی

ان ہی دو غرضوں کے لئے دار المصنفین کا خاکہ اُن کے دماغ میں آیا تھا، جو اُن کی زندگی کا اخیر کارنامہ تھا، ان کو جب کوئی نئی قلمی کتاب ہاتھ آتی یا کوئی نادر کتاب چھپکر آتی تو ان کی سرخوشی کا عجیب عالم ہوتا تھا، قلمی کتابوں کو ہر قیمت پہ خریدنے کو تیار ہوجاتے تھے، اگر ہاتھ خالی ہوتا تو حیدر آباد وغیرہ سرکاری کتب خانوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے، دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیتے، جن میں سب سے پہلا نمبر ان کے حبیب مکرم مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا تھا اور اس کی خبر دوستوں کو اور عزیز شاگردوں کو دیتے تھے، چنانچہ مکاتیب کے اوراق ان بشارتوں اور خوشخبریوں سے معمور ہین،

مولانا خود بھی اس علمی تبلیغ کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھتے تھے، چنانچہ وفات سے ڈیڑھ سال پہلے اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبد الباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:-

بھائی میں تو اب چراغِ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، المرء اعرف بنفسہ، لیکن صحیح علمی مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا؛

اگر اسمیں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معائب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔" (۵)

مولانا کو اپنی اس علمی دعوت و تبلیغ اور ادبی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے، اُن کی یہ کامیابی صرف ان کے حلقۂ تلمذ تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے حلقوں کے علما اور تعلیم یافتہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور برابر متاثر ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کے طریقۂ تحریر، اسلوبِ تحقیق اور طرزِ تنقید کی تقلید سے اب کوئی حلقہ خالی نہیں رہا۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علما میں باہم ایسا رشتۂ اتحاد ہو، اور بحیثیت ایک جماعت کے اُن کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان ان کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو، اور حکومتِ وقت اُس وقت ان کے سامنے سر جھکا دے گی، چنانچہ وہ اپنی اس تقریر میں جو "علما کے فرائض" پر ندوہ کے ایک اجلاس میں کی تھی، فرماتے ہیں:۔

"غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علمار کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علمار کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیونکہ علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصّوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ اسوقت ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اوقاف کے

لاکھوں روپیے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں، ندوہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں، اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے"

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اس وقت ابتری کی حالت میں ہے، اس کی اصلاح کر دیجائے، اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لحاظ ہوگا،

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں عدالت ہندمیں فقہی مسائل کے لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ سرنو سے قائم کیا جائے،

ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہو گی کہ تمام جماعتِ اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو، اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے، اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کرسکے، اس صورت میں ندوہ تمام قوم کو بیہودہ مراسم سے، خلافِ شرع باتوں سے، ناجائز امور سے بزور روک سکتا، اور جماعتِ اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ کا بزور پابند کرسکتا ہے، یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اتباعِ سنت کا اور اتفاق باہمی کا ہوگا" (خطبات شبلی ص ۴۳ و ۴۴)

مولانا کی نگاہ میں علمار کے فرائض کتنے وسیع تھے، وہ خود اس وسعت پر عامل اور دوسروں کو بھی اسی وسعتِ خدمت کی طرف دعوت دے رہے تھے، علمار میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے، مسلم لیگ کے زاویۂ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین

اور بیسیوں نظمیں لکھیں، احرار اسلام کی رہنمائی کی اور اُن کی بے راہ روی پر اُن کو ٹوکتے بھی رہے، ہندوستان میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعی اوّل تھے، اوقافِ اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیلِ جمعہ، اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومتِ وقت کے سامنے پیش کر کے تحریک، کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر اُن کا یہ بڑا احسان ہی، اس روشنی میں دیکھئے کہ اب آجکل جو حضرات علمار میں سیاسی گرمی ہے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہی، اور ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کے لئے جو دوربینی ہے اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہرحال سیاسی مسائل سے جو وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہی،

مولانا نے علمار کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور حالات کی پرورش کی، اور اُن کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی اس کا یہ مختصر خاکہ ہی، ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لئے تدریج کی ضرورت تھی، اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک دوست کو لکھتے ہیں

"سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علما، وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے.....غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علما، برسوں بلکہ قرنوں کے لئے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو اُن سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں، بلکہ ع

میں تو ڈوبا ہوں ولے یار کو بھی لے ڈوبوں گا" (مہدی ۱۳۰)

لیکن حقیقت یہ ہی کہ مولانا کی ان احتیاطوں کے باوجود علما اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور عجب نہیں کہ

انھوں نے اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس کی ہوگی، ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علماء اور ائمہ گذرے ہیں جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علما سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے اور لوگ اُن کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات اُن کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لئے وہ مقبول تھے اور یہاں یہ کیفیت نہیں، اس کے بعد وہ دور آیا جب ان کا خیال ادھر رجوع ہوا کہ اختلافِ خیال کے باوجود وہ علماء میں کھپ سکتے ہیں، اور ان کی تصنیفات کے اختلافی حصّہ سے قطع نظر کر کے ان کے کارآمد حصّوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے،
چنانچہ دس برس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں ایک صاحب نے اُس زمانہ میں جب بعض علماء نے سرکار بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ سیرت کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو از راہِ ہمدردی لکھا تھا کہ سیرت کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو، مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"آجکل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں، لیکن ان ہی دینداروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دینداری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا،

یقین فرمائیے زمانہ کی خربازاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہوگیا ہے، مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں، کیا سچائی پر مبنی ہے، صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا،

قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسا نہیں، بلکہ وہی منقّط قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، موجودہ عمارتِ کعبہ بھی حجاج کی ہے،

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، جاحظ عبدالقاہر جرجانی، سکاکی کا بنایا ہوا ہے، یہ سب معتزلی تھے، کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین پڑھتے تھے، حالانکہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے،

قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسا ہوتا ہے کہ وہ خذ ما صفا کرے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں،

اربابِ دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں، اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں، تاہم چونکہ مخلص ہیں، اس لئے شور و شر نہیں مچاتے، کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں، (عبدالحکیم - ۲)

لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۹ رمئی ۱۹۱۴ء کو جب منازعاتِ ندوہ کے سلسلہ میں دہلی کے بعض علماء نے علم الکلام اور الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر جب ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا:-

"میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائلِ فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔" (دیکھئے زیرعنوان عقائد وخیالات ص ۸۲۳)

اس اعلان کے ۶ ماہ بعد مولانا نے وفات پائی،

یہاں پر ایک بات نوکِ زبان پر آئی جاتی ہے مسلمانوں کو شکوک وشبہات اور الحاد وبیدینی سے بچانے کے لئے جو تدبیر ہمارے حکمائے متکلمین نے اختیار کی، وہ بھی گو اپنی جگہ پر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علومِ زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین واذعان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہو سکتا ہے کہ بیماری کے کچھ عوارض زائل ہو جائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور جس زمانہ میں ہوا، روم ومصر وشام وایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الٰہیات کے یہ شکوک وشبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوتِ ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک وشبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، تعلیم یافتگانِ نبوت جہاں پہنچے، سیدھی، سادی اور بے کج وپیچ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی اور اُسوۂ رسول جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ہاتھ میں تھے،

جن کو لے کروہ آگے بڑھتے گئے، اور تاریکی کا پردہ چاک ہوتا گیا، صحابہ کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا، ان کے زمانہ میں ہذیل، اعلاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہو کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین واخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی، یہی صورتِ حال اس دور کے بعد بھی رہی، شیخ الرئیس بو علی سینا اور حضرت ابوسعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابوسعید کا حکیم مشرق بو علی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے "انچہ تو می گوئی من می دانم وانچہ تو می دانی من می بینم" دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے صرف اپنے ملک کو دیکھئے، یہاں خیالی اور شرح مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا، اور چشت وسہرورد کے خانوادوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا، بات یہ ہے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے، لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں،

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بیکار و ہیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہو، ملتِ اسلامیہ ایک عالمگیر سلطنت ہو، اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امراء، اور وزراء تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف عہدوں اور درجوں کے کام کے لائق بنائے گئے ہیں، وزراء ہیں جو سلطنت اور فرمانروائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امراء ہیں جو

رموز سلطنت کے مشیر اور کارپرداز ہیں، سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں، اور اُن میں سے ہر ایک کی خدمت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزراء اور امرا یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام و حفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں، اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لئے وہی سب کچھ ہیں، وزراء اور امراء کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیر خواہ نہیں، کہ وہ نہوں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہو کہ مرکزی سلطنت کے مصالح و حکم کے واقف کار، اور سلطنت کی پالیسی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع و ضرر کے نگراں وزراء اور امراء ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض اور اسی کے مصالح و حکم کی رعایت ان پر واجب ہو جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہو،

متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں[1] کی ہو، جو دین کو معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے علم و فن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں، اور حضرات محدثین و فقہا و صوفیۂ صافی کی مثال سلطنت کے وزراء اور امراء کی ہو جن کے ہاتھ میں حکومت کی پالیسی، سلطنت کے مصالح و حکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجراے احکام کی طاقت ہوتی ہے، فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے

[1] امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہو اور ان کو حارس دین من تخیلات المبتدعہ کا خطاب دیا ہی، اور حج کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہ دی ہے، (باب العلم الذی ہو فرض کفایہ)

مفوّضہ حصّۂ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے، مگر سلطنت کی پالیسی اور رموزِ مملکت اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ یہ کہیں کہ ملّت کے کلّی مصالح وحِکَم کے وہ نگراں ہیں تو وہ غلطی کریں گے، اور اگر اسی طرح حضرات محدثین وفقہار یہ سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بیکار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں،

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے اس کو ملّت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنّی مفروضات تھے جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کو خاموش کرنے کے لئے انھوں نے کھڑے کرلیے تھے، اسی طرح حضرات محدّثین وفقہار کو چاہئے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر اس وقت تک اُن کو ملّت کا باغی وطاغی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگیں کہ ان مدافعی مناظروں میں ان کی زبان وقلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عینِ اسلام ہے، اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ سرحدی حفاظت کے بجائے جو اُن کا فریضہ ہے مرکزی سلطنت کے اساس وانتظام مملکت کے رموز واسرار وقواعد واحکام میں مداخلت ہے، جس کا دوسرا نام طوائف الملوکی یا بغاوت ہے، اسی لئے یہ بات بطور اصول کے مان لی گئی ہے کہ "لازم مذہب نہیں"، یعنی متکلمین کے آرار ونظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں، وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا،

گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمینِ حق اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہی کہ وہ اخیر عمر میں جب جنگجویانہ قویٰ میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت سے اُن کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہینِ عقلی کے بجائے وحی الٰہی اور تعلیم نبویؐ کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں، اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ٥ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابوالحسن اشعری نے چالیس برس کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پہ کھڑے ہو کر قبولِ حق کا اعلان کیا، کہتے ہیں کہ جب امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر دھری تھی، اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ان کی اخیر زندگی کا مشغلۂ حیات تھی، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ملا علی قاری[1] نے متعدد حکما اور متکلموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہیوں کے اعتراف اور وحیِ نبویؐ کے عقیدہ کے اقرار پہ ہوا، مرتے وقت امام جوینی کی زبان پر یہ تھا "میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" یا یہ کہا کہ "اب میں نیشا پور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی شہرستانی اور خسرو شاہی وغیرہ متکلمین سے منقول ہیں،

---

[1] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ہند ص۶، عقیدہ حمویہ کبریٰ رسائل ابن تیمیہ مصر ص۱۸۴، اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند و صواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص۹،

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اپنے ذاتی تحقیق و تجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی الغزالی[1] میں اس کو نقل کیا ہے، جو بلفظہ یہاں درج ہی،

اکثر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس (علم کلام) سے حقائق کھل جاتے ہیں اور ان کا پورا پورا علم ہو جاتا ہی، لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشف حقیقت کے بجائے خبط اور گمراہی زیادہ بڑھتی ہے اور یہ بات اگر کوئی محدث (محض) یا ظاہر پرست کہتا تو تم کو خیال ہوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہو جاتا ہی، لیکن یہ بات وہ شخص (یعنی خود امام صاحب) کہتا ہی جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ متکلمین اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ہی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے. واقفیت پیدا کی، یہ سب کرکے وہ **علم کلام سے بیزار ہو گیا،**

امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہی:

میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور و خوض کر لیا تو میں نے دیکھ لیا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب، اور میں نے پایا کہ منزلِ مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا

---

[1] الغزالی صـ۱۲۳ مولانا نے اس کے لئے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ بیان درحقیقت احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں ہے،

راستہ ہے، اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہو گیا، اس کو یہی معلوم ہوگا"[1]

حافظ ابن قیم نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کئے ہیں،

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا ہے،

نهاية اقدام العقول عقال ۔۔۔ وغاية سعي العالمين ضلال

عقلوں کے قدم کی انتہا، نا کشودہ گرہ ہے ۔۔۔ اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد ناکامی ہے

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا ۔۔۔ سوى ان جمعنا فيه قيل وقال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کر لیا'

واعلم ان بعد التوغل فی هذه المضائق و التعمق فی الاستکشاف عن اسرار هذه الحقائق رأيت الاصوب الاصلح فی هذا الباب طريقة القرآن العظيم والفرقان الكريم وهو ترك التعمق والاستدلال باقسام اجسام السموات والارضين على وجود رب العالمين ثم المبالغة فی التعظيم من غير خوض فی التفاصيل[2]،

اور جان لو کہ ان تنگ راہوں میں گھسنے اور ان حقائق کے اسرار دریافت کرنے کے لئے غور و فکر کے بعد مجھے اس باب میں صحیح و مناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا، اور وہ عقلی کرید کو چھوڑ دینا اور آسمان و زمین کے عجائبات سے اللہ کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر،

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ ممتد رہا، ۲ محرم ۶۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا، جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہ نقل کیا ہے، اس

[1] شرح حدیث النزول ابن تیمیہ ص ۱۰۵ امرتسر [2] اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۱۲۰ امرتسر،

میں موصوف نے اپنی عمر بھر کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہی،

ولقد اختبرتُ الطرق الکلامیۃ والمناہج الفلسفیۃ فمارأیت فائدۃ تساوی الفائدۃ التی وجد تہا فی القرآن العظیم،

مین نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقون کو آزما لیا تو مین نے اُن کا فائدہ اوس فائدہ کے برابر نہین پایا، جس کو مین نے قرآن عظیم مین پایا،

(طبقات الاطبا ابن ابی اصیبعہ ۲ ص ۲۷)

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ "میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا امیدوار ہو کر مر رہا ہوں"
اس وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انھون نے وفات پائی
غرض یہ احوال جس طرح دوسروں کو پیش آئے، اس حیات نامہ کے ہیرو کو بھی پیش آئے اور آخر اس کو یہ کہنا پڑا،

فلسفی سرِّ حقیقت نتوانست کشود　　گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ پر حاضری کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی اُن کے پاس نہ اب ابن رشد وغزالی ورازی وبوعلی سینا کا گذر ہے نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب وروز ہیں اور کتبِ احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیماتِ نبوی کی ترتیب، اخلاقِ نبویؐ کی تحریر، سوانحِ نبویؐ کی تلاش اور سیرتِ نبویؐ کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے کھری چارپائی ہو یا

چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا، اور ان ہی درباریوں کی ہم نشینی میں اُن کا سارا وقت گذر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربارِ رسالت کا آستانہ" (مکاتیب اوّل عبدالحکیم ۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھارہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط و کتابت تھی، اس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط مکاتیب کو پڑھ ڈالئے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت و حفاظت اور سیرتِ نبوی یہاں تک کہ دمِ نزع بھی اخیر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ **سیرت** ہی،

سیرت کی حیثیت اُن کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔" (مقدمہ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا اور اسی کو وہ سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھتے تھے، (مکاتیب اوّل حصہ اضافہ ۲)

کیا ان کے اس کام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے نہیں کیا جا سکتا کہ ادھر اُن کے قلم نے سیرت کی تصنیف کا اعلان کیا اور اُدھر مسلمانوں کی زبانوں سے بیک دفعہ لبیک کی صدا بلند ہوئی اور امداد کی نذر لے کر خود ایک والیۂ ملک آگے بڑھی اور اب جدھر سنو سیرت سیرت کا لفظ ہر مسلمان کی زبان پر تھا، پھر اس کی دوہری مقبولیت کا نشان دیکھئے وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیبِ الٰہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرتِ پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی، اس کوشش میں مقدس علما بھی شریک ہو گئے، نو تعلیم یافتہ اہلِ قلم بھی، گم کردہ راہ مدعیِ اسلام فرقے بھی، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔"

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابرِ کرم سے محروم نہ رہی، ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کے چھینٹوں نے اُس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، بحرِ ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اس کی فوج ظفر موج سے معمور ہوگئی، تیسری صدی کا خاتمہ تھا، کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی، اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا، اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نامور ہوا جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لیکر بحرِ ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا،

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پُرشور کر دیا، اور غزنی سے لیکر پنجاب تک یک تخت اسلام کی حکومت قائم کر دی چھٹی صدی میں غوری آئے تو انھوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرنگیں کر دیا، وہ دن ہے اور

آج کا دن ہے کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہے جس میں نو کروڑ توحید کے حلقہ بگوش اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں،

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان

جس طرح ہندوستان کو خراسان وماوراء النہر وعراق وعجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا اسی طرح اس کے دل ودماغ کو انہی ملکوں کے اربابِ کمال نے اپنا باجگذار بنایا، قطار در قطار علماء بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے، اُس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا ملتان اور سندھ کے بعد اُن کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوتی، سلطان شمس الدین التمش نے جب ۶۰۷ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علماء سمٹ سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے،

غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ - ۶۸۵ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد وغیرہ بیسیوں اربابِ کمال تھے، جن کے علم وفضل کی رونق سے دلی بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی،

علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ - ۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین یحیٰی، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیالیس علماء دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے،

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال تھے، جن کے دامنِ تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جونپوری پرورش پاکر ملک العلماء بن کے نکلے،

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم

اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علماء کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ، بخارا، کاشان، فوسنج (ترکستان) رے اور دمشق کے علماء کے نام تھے تو اب ملتان، بھکر، ہانسی، دلی، تھانیسر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے جاتے ہیں، ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے، بھکر سندھ میں ہے، ہانسی پنجاب کے جنوب ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے،

مورخ ضیاء برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ تا ۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علماء کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں، وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں: "در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشد، و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصولِ فقہ و اصولِ دین و نحو و لفظ و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے می شگافتند و ہر سالے چندیں طالبانِ علم ازاں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند، و مستحقِ جواب دادن فتویٰ می شدند و بعضے ازاں استاداں در فنون علم و کمالاتِ علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند، چنانچہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرباہی و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم

۱؎ مضمون "اسلامی نصابِ درس" مولانا سید عبدالحئی مرحوم الندوہ فروری ۱۹۰۹ء،

ومولنا ظہیر الدین لنگ وقاضی مغیث الدین بیانہ ومولنا رکن الدین سنامی ومولنا تاج الدین کلاہی
ومولنا ظہیر الدین بھکری وقاضی محی الدین کاشانی ومولنا کمال الدین کولی ومولنا وجیہ الدین پایلی و
مولنا منہاج الدین قاینی ومولنا نظام الدین کلاہی ومولنا نصیر الدین کڑہ ومولنا نصیر الدین صابونی
ومولنا علاء الدین تاجر ومولنا کریم الدین جوہری ومولنا حجت ملتانی قدیم ومولنا حمید الدین مخلص ومولنا
برہان الدین بھکری ومولنا افتخار الدین برنی ومولنا حسام الدین سرخ ومولنا وحید الدین ملہو ومولنا علاء الدین
کرک ومولنا حسام الدین ابن شادی ومولنا حمید الدین بنیانی ومولنا شہاب الدین ملتانی ومولنا
فخر الدین ہانسوی ومولنا فخر الدین سقاقل ومولنا صلاح الدین سترکی وقاضی زین الدین ناقلہ ومولانا
وجیہ الدین رازی ومولنا علاء الدین صدر الشریعۃ ومولنا میران ماریکلہ ومولنا نجیب الدین ساوی و
مولنا شمس الدین تم ومولنا صدر الدین گندہک ومولنا علاء الدین لوہوری ومولنا شمس الدین یحیی
وقاضی شمس الدین گازرونی ومولنا صدر الدین تادی ومولنا معین الدین لونی ومولنا افتخار الدین
رازی ومولنا معز الدین اندہپنی ومولنا نجم الدین انتشار وچہل وشش استاد مذکور کہ من القاب اسامی
ایشاں نوشتہ ام آنانند کہ من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام وبخدمت بعضے رسیدہ، وبیشترے را در مسند افادات
ودر محافل ومجالس دیدہ، وبسیاراں از شاگردان مولائی شرف الدین پوشنجی واستادان بیگر کہ من
القاب ایشاں نیاوردہ ام در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند ودایم سبق می گفتند، در آخر عہد علائی
مولنا علم الدین نبیسۂ شیخ بہاء الدین زکریا[1] کہ جہانِ علم وعالمِ دانش بود در دہلی رسیدہ، واگر من خواہم کہ در
تاریخ جملہ استاداں ومتعلمانے کہ در محلِ استاذی رسیدہ بودند ذکر کنم بہ تطویل انجامد واز غرض باز مانم وافسوس
ہزار افسوس کہ قدر وقیمتِ بزرگی وفضلِ آں استادان سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد

[1] ملتانی،

حقوقِ ایشان نہ گذاردہ، و نہ معاصرانِ عہد دانستند کہ خاکِ قدم آنچناں استاداں را در چشمِ جہاں بیں خود کشند، و نہ من کہ مؤلف ام دراں ایام خبرے از جلال و کمالِ ایشاں ادراک کردم، و امروز کہ قرنی بیشتر گذشتہ کہ آں عدیم المثالاں بہ جوارِ رحمتِ رب العالمین پیوستہ اند و بہ درگاہِ قربِ حضرتِ بے نیازی ترقی کردہ و بعد از ایشاں نہ ہیچو ایشاں و نہ ہزارم بجز ذات ایشاں مرا نہ دیگرے را نظر آمدہ، بعضے کہ قدر و قیمتِ ایشاں دریافتہ ام کہ اگر در کمالات علوم و تفنن ہر یکے مجلدے بہ نویسم مقصر باشم، و دراں ایام کہ استاداں کہ ہر یکے ابو یوسف قاضی و محمد شیبانی عہد و عصرِ خویش بودند بہ صدرِ حیات افادت می کردند، اگر مفتیٔ طمطراقِ استاذی بر سر کردہ از خراسان و ماوراء النہر و خوارزم و یا از شہرے دیگر در دہلی برسیدی و کمالات علوم بزرگان مذکور را مشاہدہ کردی سبق درست گرفتے و بہ تلمذ پیش ایشاں بزانوے ادب در آمدی، و اگر در حیات آں استاداں تصنیفی جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق در شہر آوردندی کہ اگر استادانِ شہرِ ما آں تصنیف را استحسان و اعتباری کردندی معتبر شدی و الا مہجور ماندے، و مقصود از ذکر ایشاں در تاریخ علائی آں است کہ چہ عصرے و عہدے بود کہ دراں عہد و عصر چندیں متفننانِ نفائسِ علوم بصدرِ حیات در افادتِ علوم مشغول باشد و چگونہ آں عصر مستثنائے عصر و آں شہر مستثنائے شہرہائے رُبعِ مسکوں نہ باشد۔" (فیروز شاہی برنی صـ ۳۵۲ تـ ۳۵۵ کلکتہ)

علم کا قافلہ پورب کو | ان بزرگوں کی نسبتِ وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان، قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نامور تھے، تو ان کے پہلو بہ پہلو اب ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام (پٹیالہ) بیانہ (ریاست بھرت پور) ہانسی (پنجاب) دتی، اندپت (دہلی کے پاس) کڑہ (الہ آباد کے پاس) کول (علی گڈھ) پائل، سترکھ (بارہ بنکی اودھ)

کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں، یعنی علم کا قدم اب پچھم سے بڑھ کر پورب کی طرف اُٹھ رہا ہے، ان بزرگوں کی عظمت و جلالت یہ تھی کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی و رازی کا ہمسر بتاتا ہے جن کی توثیق و سند سے بخارا و سمرقند و خوارزم اور عراق کے اماموں کی تصنیفیں اعتبار و مرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں | غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی، اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل **بدایوں** معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیّاحِ معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملا دیا، اس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولٰنا علاء الدّین اصولی بدایونی (اُستادِ نظام الاولیا) قاضی جمال بدایونی ملتانی، رُکن الدّین بدایونی، خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں، خواجہ نخشبی بدایونی وہ ہیں جنھوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطے اُڑائے ہیں، تصوُّف میں اُن کی دو کتابیں "سلک السلوک" اور "کلّیات و جزئیات" ہمارے کتبخانہ میں ہیں،

کڑہ | بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑہ اب بھی ایک قصبہ ہے، مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا، سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدّین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بدندان ہے، اسی شہر میں دریا کنارے گذرا تھا، عہد علائی میں مولٰنا نصیر الدّین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور ان کے بعد مولٰنا مطہر کڑہ کا نام آتا ہے جن کے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڑہ کو ہاتھ آئے ہیں، یہ حضرت نصیر الدّین اودھی چراغ دہلی کے مرید تھے[1]

اودھ | بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ ہے، جس کو اودھ کہتے ہیں، یہ اصل میں اُس شہر کا نام تھا

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۷۰،

جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہی، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سی مشہور ہی، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا، اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا،

دلی جس زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے نور سے جگمگا رہی تھی، اس کی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں، اس مطلع خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا اس کا نام شمس الدین یحییٰ الاودی ہی، یہ اودھ کے تھے، اسی لئے اودھی کہلاتے ہیں، اسی زمانہ میں اس تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی، اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے،

ان سی پہلے مولنا فرید الدین کا نام آتا ہی، جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولنا فرید الدین اودھی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحییٰ اودھی ہیں، اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ہیں، اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا،

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہی، لکھتے ہیں: "مولنا علاء الدین نیلی کہ خلیفۂ سلطان المشائخ بود . . . . . . در کشفِ غوامضِ کشاف و مفتاح مثل نہ داشت و در مجلس مولنا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلامِ اودھ بود، قاری کشاف خدمت مولنا علاء الدین (نیلی اودھی) بود، و خدمت مولانا شمس الدین یحییٰ و علماے اودھ سامع بودند" (ص۲۰۵)

اس سی معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے عہد میں شیخ الاسلامِ اودھ کی درسگاہ میں اودھ کے علماء کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا، جنہیں سی تین نے خاص امتیاز پایا،

۱- شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی، المتوفی ۷۴۸ھ

۲- نصیر الدین محمود چراغ دہلی اودھی المتوفی ۷۵۷ھ

۳- شیخ علاء الدین نیلی اودھی، المتوفی ۷۶۲ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کی پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے خلفاء میں اودھ کے قصبہ گوپامئو (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے، اودھ کے علماء جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگتے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوتا کہ راستہ میں اُن سے ملتے جائیں، سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے "ویارانِ اودھ چنانکہ مولانا شمس الدین یحییٰ و شیخ نصیر الدین محمود و مولانا علاء الدین نیلی و عزیزان دیگر چوں از خدمتِ سلطان المشائخ باز می گشتند فرمان می شد چوں در گوپامئو برسید خواجہ مبارک را بہ بینید" (ص ۲۱۳) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار گوپامئو (ہردوئی) کے ادھر ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے، اودھ سے اصل مقصود تو اجودھیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا، ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (ص ۱۹۰) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں، جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۰۵ھ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں، ان ہی میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے، جس کو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر اشرف سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ کی خوابگاہ بننے کی عزت حاصل ہے،

قنوج اور کڑا دلی اور ممالکِ پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا، اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کڑہ (الہ آباد) تھی، ممالکِ پورب کے دونوں بازوؤں پر یہ دو شہر آباد تھے، ان

دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی، قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہت اور پورینیہ ہو کر بنگال، اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کڑہ سے پار ہو کر جونپور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھکر بنگال، یہی دونوں راستے آج بھی ہیں، ایک پر ای، آئی ریلوے ہے، اور دوسری پر بی، این، ڈبلو، ریل۔[1]

ظفرآباد اور جونپور سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور مشرقی حصوں میں اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا، اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفرخاں، اور دوسرے کا فخرالدین جونا تھا، پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفرآباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروزشاہ تغلق (۷۵۲ھ۔۷۹۰ھ) نے جونپور آباد کیا،[2] یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی، کیونکہ اس سال سلطان فیروزشاہ نے بنگال سے لوٹ کر جونپور میں قیام کیا تھا،[3]

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جونپور و ظفرآباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی، ۷۹۶ھ میں[4] خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جونپور کو اپنا مرکز بنایا، اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملیگا، "درعرصۂ جون پور رفت، بہ آہستگی اقطاع قنوج وکڑہ (الٰہ آباد) اودھ وسندیہ (سندیلہ؟) ودل مئو وبہرائچ وبہار وترہت را درقبض وتصرف خود آورد" (صفحہ ۱۵۶ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج، بہرائچ اور الٰہ آباد سے لیکر بہار اور ترہت (مظفرپور، دربھنگہ وغیرہ) تک ملک پورب کی وسعت تھی، آٹھویں صدی کے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں، "بدرالدین اودھی، تاج الدین کڑہ، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال ستر کھ (بارہ بنکی)

---

[1] خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنوتی) کی منزلیں تاریخوں میں پڑھو [2] آئین اکبری جلد ۲ صفحہ ۷۱ نولکشور [3] مبارک شاہی صفحہ ۱۲۵ کلکتہ [4] فرشتہ میں ۷۷۶ھ ہے،

رکن الدین کڑہ، رکن الدین ظفرآبادی (جونپور) رکن الدین بہاری، مخدوم شرف الدین بہاری، زین الدین دیوہ (بارہ بنکی) قاضی سمارالدین بجنور (لکھنؤ) صلاح الدین سترکھ (بارہ بنکی) علاءالدین اودھی، علاءالدین سندیلوی، قاضی فخرالدین سترکھ، شیخ مبارک گوپامئو (اودھ) شیخ محمد معروف امیٹھی (اودھ) منہاج الدین بہاری وغیرہ،[1]

ملک پورب (مشرق) خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا، اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے اس کی جگہ خودمختارانہ جلوس کیا، یعنی نویں صدی ہجری کے آغاز سے پورب کی آزاد و خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی، مبارک شاہ ۸۰۴ھ میں مرگیا، اور اب اس کی جگہ پر ابراہیم شاہ شرقی بیٹھا جو اس خاندان کا سب سے بڑا نامور فرمانروا گذرا ہے، اس نے جونپور میں چالیس برس حکومت کرکے ۸۴۴ھ میں وفات پائی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں لاہور، ملتان اور دلی سے علم کا مرکز منتقل ہو کر پورب کے اطراف میں آیا، گو اس حکومت نے اس کے بعد صرف چالیس برس کی اور زندگی پائی، یعنی ۸۸۳ھ میں بہلول لودی کے ہاتھ سے یہ مٹ گئی، اور یہ زمانہ بھی شرقی بادشاہوں کی جنگجوئی، اور دلی کے لودھی بادشاہوں کے دست برد سے امن اور چین سے نہیں گذرا، تاہم علم وفن کی جو شمعیں روشن تھیں، وہ سیاسی حوادث کی ان آندھیوں سے نہ بجھیں، بلکہ انکی روشنی روز بروز اور تیز ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ تیموریوں کے عہد میں یہ خطہ اور سراپا نور بن گیا، شاہجہاں فخریہ کہا کرتا تھا کہ "پورب شیراز ماست" علامہ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ پورب کی وسعت میں تین صوبے تھے، صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ اور صوبۂ عظیم آباد،

[1] یہ نام نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم جزء ثامنہ ثامنہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چنے گئے ہیں،

مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے، اور قنوج سے لیکر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا، جس میں اودھ اور جونپور دونوں شامل تھے، اور دوسرا صوبہ کڑہ یعنی الہ آباد کا تھا، جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کانپور سے لیکر کڑہ، مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گذرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبۂ عظیم آباد موجودہ بہار کا صوبہ ہے،

صوبۂ الہ آباد و اودھ

یہاں ہم کو صرف صوبۂ الہ آباد اور صوبۂ اودھ سے غرض ہے، متنبی کا مشہور مصرع ہے ؎

مصائب قوم عند قوم فوائد، یعنی ایک کی مصیبت دوسرے کی مسرت کا ذریعہ ہوتی ہے، جس زمانہ میں خراسان و ایران تاتاریوں کے حملہ سے زیر و زبر ہو رہے تھے، ہندوستان میں خلجیوں کا زمانہ تھا، اور امن کا دور دورہ، ساتویں صدی کے آخری سال گذر رہے تھے، دو بزرگ ایک صفی الدین جو حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے اور دوسرے شمس الدین زاولی اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہندوستان آئے، اور دلی میں سکونت اختیار کی، صفی الدین کے پوتے نظام الدین اور شمس الدین کے بیٹے شہاب الدین نے علمائے دہلی کے سامنے زانوے ادب تہ کئے، اور نامور ہو کر دلی میں ہنگامۂ درس بلند کیا، اور شہاب الدین ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے سربلند ہوئے،

جون پور

دلی بگڑ کر پورب کئی دفعہ آباد ہوا ہے، دو آبادیاں تو آنکھوں کے سامنے ہیں، دلی پر جب نادر شاہ درانی، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں اور جاٹوں کی چڑھائی ہوئی تو کتنے باکمال لکھنؤ اور عظیم آباد کو چلے آئے، پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے دلی کو تباہ کیا، تو پھر دلی بگڑ کر پورب

آباد ہوا، اسی طرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو ارباب فضل وکمال نے پورب کا رخ کیا، اس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خودمختار مشرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی، اور جونپور آکر رخت اقامت ڈالا، بادشاہِ وقت نے بیش از بیش قدردانی کی،

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا، ان کے تین لڑکے ہوئے، صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین، تینوں نے اپنے نانا کے درس وکمال سے فیض پایا، شیخ صفی الدین ہی نے درس وافادہ کا بازار گرم کیا، عربی صرف ونحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی ان کی تصنیف ہے، شیخ صفی الدین اسی زمانہ میں ردولی جاکر سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی سے جو ان دنوں وہاں مقیم تھے مرید ہوئے، شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہوئے، ان بھائیوں کی اولادوں نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی، جن کے سلسلہ میں اب تک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے، شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی، شیخ صفی کے ایک بیٹے ابوالمکارم اسمٰعیل المتوفی ۸۶۰ھ تھے یہ وہی ہیں جن کے لئے صفی نے دستور المبتدی لکھی، اور انہی کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں،

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کو اپنے فیوض وبرکات کا مرکز بنایا، اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پاکر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد کے پاس جسکا نام مسجد اٹالہ ہے دفن ہوئے، یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلی سے لائے تھے، دلی میں انھوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی

قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہی تحصیل علم کی، جونپور کی مسند پر جب آکر وہ بیٹھے تو ان کے فیض کمال سے مشرق کی ساری سرزمین لہلہا اٹھی، کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں یہ فیض جاری ہوا،

اودھ | صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا، اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا، جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا، حضرت شاہ ابوالعباس المتوفی ۷۰۳ھ اور شیخ بہاء الدین اکبر المتوفی ۷۸۰ھ اور شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۹۹۰ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دارالسلطنت بنایا، ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا، مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی،

لکھنؤ | لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا، چونکہ قنوج اور جونپور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی، اس لئے رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھنے لگی، تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملہ کے بعد ۸۰۳ھ میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا، اور ظفر خاں نے گجرات میں، خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج و اودھ و کڑہ اور جونپور میں، اور خضر خاں نے لاہور و دیبال پور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں، تو ملو اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیئے، اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے "ملو اقبال خاں بہ قنوج رفتہ خواست کہ بہ جونپور و لکھنؤ در آید" (صفحہ ۱۵۹ نولکشور) اس سے معلوم ہوا کہ جونپور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی،

اسلام کی بہت سی آبادیاں اُن نفوسِ قدسیہ کی یادگار ہیں، جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان

میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے، لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے،

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانہ میں تھے، اور جنھوں نے ۷۸۵ھ

میں وفات پائی ہے، اُن کے مرید و خلیفہ شیخ قوام الدین تھے، محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے

کہ "مقبرۂ او در لکھنؤ است یزار و یتبرک بہ"[1] ۸۴۰ھ میں وفات پائی، ان کے مرید و خلیفہ شیخ سارنگ

تھے، جنھوں نے ۸۵۵ھ میں رحلت کی، ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ مینا ہیں، جن کا مزار

لکھنؤ میں (موجودہ مڈیکل کالج کے پاس) ہے، مخدوم شیخ مینا نے ۸۸۴ھ میں انتقال فرمایا،

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے، کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی

کے کنارے لکھنؤ آکر بسے تھے، تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی

کرمان سے ہندوستان آئے، اور شیخ موصوف سے ملنے کے لئے وہ لکھنؤ وارد ہوئے، اور یہیں کے

ہو رہے، ان کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں جو بڑے عالم ہوئے ہیں، ان کی اولاد اب تک لکھنؤ،

دیوہ اور اناؤ میں آباد ہے، شیخ اعظم پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم و فضل کا مرکز بنایا، وہ اس

تحفہ کو جون پور سے لائے،

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلّی سے جونپور گئے تھے، ان میں سے قاضی عبد المقتدر دہلوی

کے پوتے شیخ ابو الفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر و مدرس تھے، اور قاضی شہاب الدین

کے معاصر و ہم استاد تھے، ۸۵۰ھ میں وفات پائی،[2] ان کے دامنِ تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان

ہوئے، اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی،[3] شیخ اعظم کے تلامذہ شیخ ضیا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیرآبادی

[1] صفحہ ۱۴۶ [2] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳ [3] اخبار الاخیار ص ۱۶۲ [4] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳،

المتوفی سنہ ۸۸۲ھ ہیں، شیخ کا مزار خیرآباد میں اب بھی مرجع خلائق ہے،

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ سماء الدین لکھنوی کا ہے، ان کے صاحبزادہ شیخ الاسلام سعد اللہ فراز کندوری ہیں، سنہ ۸۲۹ھ میں وفات پائی، ان کے جانشین اور صاحبزادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں، اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں، ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اور ان کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں، ان کے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنھوں نے سنہ ۹۰۱ھ میں وفات پائی، تاریخ علمائے ہند کا بیان ہے "مدام بہ درس و افادۂ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسۂ وے طلبۂ مستعد رجوع می کردند"[۵] شیخ امین الدین کے صاحبزادہ شیخ حامد تھے جن کے نام مکتوبات میں متعدد خط ہیں، اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کی ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہے، "شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین ابن شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ بن زائر الحرمین الشریفین شیخ سماء الدین بن بندگی حضرت مخدوم قاضی فخر الدین بلوی"(۹)

لکھنؤ کے پاس کسمنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ عبد القادر بن شیخ سلطان جو مولنا قطب الدین محدث بن مولنا خضر محدث کی اولاد سے تھے، پیدا ہوئے، انھوں نے لاہور جا کر علم کا فیض حاصل کیا، اور لکھنؤ آ کر درس و افادہ کی نہر بہائی، جو چالیس برس تک جاری رہی، لکھنؤ کے اطراف میں ان کے ذریعہ بڑا علم پھیلا، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا وسط ہے، ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب کا ہے جن کی نسبت سے لکھنؤ میں اب تک گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے، سنہ ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی، ان کا اصل وطن جونپور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیاہو ہے، مگر عمر لکھنؤ میں گذاری اور یہیں دفن ہوئے، شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ

---

[۵] تاریخ علمائے ہند ص ۷۵،

شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں، شیخ محمد آفاق لکھنوی درا صل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تقدیر لکھنؤ لے آئی، اور اپنے پیر کے پائینتی آسودہ ہیں،

موجودہ اعظم گڈھ اور غازیپور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہی، جو اس وقت اعظم گڈھ کے ضلع میں ہی، یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے، اُن کے صاحبزادہ شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے، میر محمد شفیع بھی شیخ عطاء اللہ کے شاگرد تھے، شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر محمد شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کی، اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے، اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علما ان کی شاگردی پر نازاں ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا، ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی، اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کیلئے آرام کیا

فرنگی محل

اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہی، جو لکھنؤ کے اُفق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے، اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر ان کے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا، یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا، یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا تھا جس میں مولنا حالی اور دیگر نامور پیدا ہوئے، دوسرا حصہ اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا، ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں، اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے،

میر فتح اللہ شیرازی

میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لیکر ہندوستان وارد ہوئے، اور ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہنچے، اکبر نے بڑی قدر کی، ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا، اور وہیں خاک میں مل گیا، ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر مذکور ہی کے ذریعہ پھیلا، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں :- " تصانیفِ علمائے متاخرین ولایت

مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان میر بہ ہندوستان آوردہ، و در حلقۂ درس اندر بجز غفیر از حاشیۂ محفل میر استفادہ کردند، و ازاں عہد معقولات را رواج دیگر پیدا شد۔" (صفحہ ۲۳۰/۲)

ملا عبدالسلام لاہوری میر فتح اللہ شیرازی کے دامن تربیت میں جن باکمالوں نے پرورش پائی، ان میں ایک ملا عبدالسلام لاہوری ہیں، ساٹھ برس تک درس وتدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، ۱۰۳۷ھ میں نوے سال کی عمر میں[1] وفات پائی،

ملا عبدالسلام دیوہ اودھ میں (موجودہ بارہ بنکی کے ضلع میں) دیوہ ایک مشہور قصبہ ہے، اس سرزمین نے ملا عبدالسلام لاہوری کے ہمنام ملا عبدالسلام دیوہ کو پیدا کیا، ملا صاحب پورب میں ایک حد تک پڑھ پڑھا کر لاہور گئے اور ملا عبدالسلام لاہوری کے درس میں بیٹھے، اور نامور بن کر اٹھے، گو شاہجہاں نے فوج میں محکمۂ افتا کا منصب اُن کو دیا تھا، مگر لاہور کی آب وہوا ان کو آخر پھر وہیں کھینچ لے گئی، اور وہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق ومغرب میں شروع ہوا،

ملا دانیال چوراسی ملا دیوہ کے کئی شاگرد مشہور ہوئے، پچھم میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی (الہ آباد) شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ اصفت الہ آبادی، ملا دانیال چوراسی کے شاگرد، ملا قطب الدین سہالوی تھے،

شیخ محب اللہ الہ آبادی خیر آباد کے مشہور قصبہ کے پاس صدرپور ایک مقام ہے، وہاں ایک فاروقی خاندان آباد تھا، اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ محب اللہ پیدا ہوئے، جنھوں نے لاہور جا کر ملا عبدالسلام دیوی سے کسب کمال کیا اور واپس آکر الہ آباد کو اپنے فیض تربیت کا مرکز بنایا، ان کو ہندوستان کا

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۶/۲

محی الدین ابن عربی کہا جائے تو بجا ہے، اسی لئے ابن عربی کو اگر شیخ اکبر کہا جاتا ہے تو ان کو شیخ کبیر، اسی خاندان کے آخری یادگار مولنا محمد حسین صاحب الہ آبادی تھے،

قاضی گھاسی | شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگردوں میں کئی اصحاب باکمال ہوئے، جنمیں سے قاضی گھاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی اور میر سید محمدی فیاض امروہوی کے نام معلوم ہیں[1]، شیخ نے سنہ ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی،

قاضی گھاسی الہ آبادی کے زمرۂ تلامذہ میں ملا قطب الدین سہالوی بھی داخل ہیں، ملا صاحب نے قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، اس سلسلہ سے ملا قطب الدین فرنگی محل لکھنؤ اور دائرہ شاہ محب اللہ الہ آباد کے سنگم یا مجمع البحرین ہیں،

شیخ آصف الہ آبادی | قاضی محمد آصف الہ آبادی، ملا عبد السلام دیوہ کے ممتاز شاگرد اصل میں خیر آباد کے پاس کے گاؤں صدر پور کے رہنے والے تھے، اور الہ آباد میں قاضی تھے، ان کے شاگرد شیخ محمد افضل الہ آبادی ہوئے،

شیخ محمد افضل الہ آبادی | غازی پور کے ضلع میں سید پور شرفا کا مشہور قصبہ ہے، اس قصبہ میں وہ نامور بزرگ پیدا ہوئے، جن کو دنیا شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نام سے جانتی ہے، الہ آباد کے بارہ دائروں میں ایک دائرہ اسی نقطۂ فضیلت کی کشش سے پیدا ہوا ہے، انھوں نے قاضی آصف الہ آبادی اور ملا نور الدین جونپوری سے فیض پایا، شیخ کو اپنے زمانہ میں قبولِ خاص و عام حاصل ہوا، سنہ ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی، مزار الہ آباد میں ہے،

شیخ افضل کے تلامذہ میں ایک ان کے صاحبزادہ شیخ محمد یحیٰی خوب اللہ المتوفی سنہ ۱۱۴۴ھ ہیں، اور شاہ خوب اللہ کے جانشین شاہ محمد فاخر الہ آبادی المتوفی سنہ ۱۱۶۴ھ اور شیخ محمد ناصر ہیں، اس سلسلہ فیض نے پورب کے اضلاع کو سرسبز و شاداب کیا، اور ظاہر و باطن کے برکات[2] سے بھر دیا،

ملا قطب الدین سہالوی | ملا قطب الدین سہالوی نے جیسا کہ اوپر گذرا شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی الٰہ آبادی

سے کسبِ فیض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر ہمارے قصبات تک دار العلم تھے، ملا قطب الدین

سہالوی نے سہالی میں اپنی درسگاہ ترتیب دی، اور جوق جوق طلبہ دیار و اطراف سے آنے لگے، یہاں تک

کہ زمینداری کے ایک جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور بہنیتی پور کے خان زادوں کے ہاتھوں

سے شہادت پائی، ان کے مشہور تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، حافظ امان اللہ بنارسی، قاضی

شہاب الدین گوپاموی، حاجی صبغۃ اللہ[1] خیر آبادی محدث اور مولوی اسمٰعیل اورنگ آبادی وغیرہ ہیں،

ملا قطب الدین شمس آبادی | ملا صاحب کے مطلعِ درس سے جو پہلا آفتاب چمکا، وہ سید قطب الدین شمس آبادی

ہیں، سید موصوف اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے، جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے، تعلیم سے فراغت کے

بعد اس قطب نے امیٹھی کے بجائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا، یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں قنوج کے پاس ہے

آزاد لکھتے ہیں :- "در شمس آباد مسند افادہ گسترد و جمِ غفیرا بہ افاضۂ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل گرا نمود" (مآثر الکرام ص ۲۱۰)

شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہوگیا،

ملا محب اللہ بہاری | اس "جمِ غفیر" میں جو ملا شمس آبادی کی دانش گاہ سے مرتبۂ کمال کو پہنچے ایک نامور

بھٹہ پور سے آکر شامل ہوئے، یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑا محب علی پور سے، دنیا ان کو قاضی محب اللہ

بہاری مصنفِ سلّم و مسلّم کے نام سے پہچانتی ہے، تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے، یہ عالمگیر کا زمانہ

تھا، محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے، ۱۱۱۹ھ میں وفات

پائی، اور شیخ فریدالدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاندپورہ میں دفن ہوئے، بعض

[1] میر آزاد نے مآثر الکرام میں انکو قطب الدین شمس آبادی کا شاگرد لکھا ہے، عرب جا کر شیخ طاہر فتنی اور ابراہیم کردی محدثین مکہ معظمہ سے حدیث پڑھی،

صاحبوں نے ملا محب اللہ بہاری کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا ہے[1]،

حافظ امان اللہ بنارسی قاضی محب اللہ بہاری کے ایک اور معاصر امام وقت تھے، ان کا نام حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین ہے، بنارس وطن تھا، ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لیکر فارغ ہوئے تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا، حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جون پوری نے ملا باقر داماد استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جن پر خود پیر کو فخر تھا، ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی، ان کی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے، اور میں نے اس کی زیارت کی ہے،

ملا نظام الدین فرنگی محلی ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا، جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا، اور اسی مناسبت سے وہ فرنگی محل کہلاتا تھا، یہی وہ فرنگی محل ہے جو آگے چل کر پورب کا سب سے بڑا دار العلوم بنا،

ملا قطب الدین کے کئی صاحبزادے تھے، مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوئے جن کی نسبت سے عربی کا درسِ نظامی مشہور ہے، موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود اُن کے والد ماجد کا آغوشِ تربیت ہے، باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علماء کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا، اپنے والد کے شاگردوں ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا، اور آخری تکمیل شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے کی، ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ

[1] حاشیہ شرح ملا حسن از مولوی عبد الحلیم لکھنوی، معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کو قطبین یعنی ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین شمس آبادی میں جو دونوں استاد و شاگرد ہیں التباس ہوگیا ہے،

ملا نظام الدین کی ذاتِ گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے، یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا، میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہمعصر ہیں اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں:- "و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بہ مولوی دارند، و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ باو می رساند، بین الفضلا علم امتیازی افرازد، و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہاے دیگر کردہ اند و برای اعتبار خاتمۂ فراغ از مولوی گرفتند سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی، ابدی آرام گاہ لکھنؤ ہے،

مدرسینِ فرنگی محل ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلما مولنا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی سنہ ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا، اور اب بھی اسکی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ قائم ہے، ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادہ ملا عبد العلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض بڑھکر دریائے فیض بن گیا، اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا، اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا، مدراس میں سنہ ۱۲۳۵ھ میں وفات پائی،

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے، جن کے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں ان میں سے ملا کمال الدین، ملا حسن، ملا مبین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں، اوران میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے،

ملا کمال الدین اور ملا حمد اللہ ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور باکمال شاگرد ہیں، ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی سنہ ۱۱۷۵ھ، اور دوسرے ملا حمد اللہ سندیلہ المتوفی سنہ ۱۱۶۰ھ، یہ ملا حمد اللہ وہی ہیں جن کی کتاب حمد اللہ مشہور ہے، انھوں نے سندیلہ میں اپنی درسگاہ جمائی، جس سے بہت سے نامور پیدا ہوئے،

ملا باب اللہ جون پوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری

ملا احمد اللہ کے ایک نامور شاگرد، ملا باب اللہ جون پوری ہیں، اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں، جن کا حاشیہ "غلام یحییٰ بر میر زاہد" درسِ نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے، اکیڑ نام[2] ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اور بہار میں مخدوم شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے، سنہ ۱۱۸۶ھ[1] سالِ وفات ہے،

سلسلۂ خیرآباد

ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلہ ہیں، فضل و کمال کا یہی وہ نخلِ بارور ہے جس سے خیرآباد کی وہ شاخ نکلی ہے، جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے، اور جو "سلسلۂ خیرآباد" کے نام سے مشہور ہے، ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخِ فاروقی میں ہیں، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا احمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسبِ فیض کیا، اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالامال کیا، اور بارہویں صدی کے آخر میں ۲۳ محرم سنہ ۱۱۹ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا، ملا محمد اعلم کے شاگردوں میں ان کے بھانجے مولوی سید عبد الواجد خیرآبادی کامل ہوئے، اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعلم کے شاگرد ملا ارشد تھے، اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبد الواجد خیرآبادی، ملا عبد الواجد سے ملا نظام الدین اور ملا نظام العالم سے مولانا فضل امام خیرآبادی نے پڑھا، مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے، بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمد نامہ ان ہی کی آمد طبع کا نتیجہ ہے، سنہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی،

مرحوم کے جانشین، صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے، جن کے دمِ عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے، و دیار و اطراف سے طلبہ نے ان کی

---

[1] تاریخ علمائے ہند صفحہ ۱۵۹ میں سنہ ۱۱۲۵ھ لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ وہ حضرت مرزا جانجاناں علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور مرزا صاحب سنہ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ایک رسالہ پر تقریظ لکھی ہے، بظاہر وہ ستر برس کی عمر میں مرشد نہیں بن سکتے تھے، اور نہ تقریظ لکھ سکتے تھے، مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں ان کا واقعۂ ارتحال نقل فرمایا ہے اور تاریخ سنہ ۱۱۸۶ھ لکھی ہے، (کلمات طیبات خطوط مرزا صاحب صفحہ ۷۰)

[2] یہ گاؤں نگرنہسہ ضلع پٹنہ کے قریب ہے،

طرف رجوع کیا، اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا، شروح و حواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائجِ طبع تھیں، داخلِ درس ہوئیں، فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ اور شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ کتابیں عربی طلبہ کی تعلیم کے لئے لکھیں اور مقبولِ عام ہوئیں، غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی،

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی، اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے، ان بزرگوں میں سے تین اربابِ کمال کی درسگاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی، مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف الصدق مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری جون پوری، مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رامپور کی قدردانی سے رامپور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا، مولانا برکات احمد صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، ان کے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے، مولانا برکات احمد صاحب نے رئیسِ ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپور سے جونپور آئے، اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی، ان میں سے ہر ایک کی درسگاہ سے سینکڑوں علما تعلیم پاکر نکلے،

فرنگی محل کا اخیر دور | اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دارالعلم میں فضل و کمال کی بیسیوں بساطیں بچھی رہیں، ان ہی میں سے مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے، مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحیم صاحب فرنگی محلی کے صاحبزادہ اور جانشین تھے، ان کے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحبزادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے، والد کے بعد ان کی جگہ یہ مفتی ہوئے، روز و شب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصبِ افتا کی خدمت

انجام دیتے، جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی بساط الٹی تو علم کا یہ مرکز جونپور کے مدرسۂ امام بخش میں منتقل ہو گیا، یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے، اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں ابدی نیند سو گئے،

مفتی احمد ابوالرحم کے دوسرے صاحبزادہ کا نام مولوی اکبر تھا، ان کے بیٹے مولوی امین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علماء مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا، اور یہ شہرت حاصل کی کہ علماء نے ان کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، ۱۲۶۱ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندا کی طلب پر باندا گئے، اور کئی برس رہے، وہاں سے واپس آکر جون پور کے مدرسۂ امام بخش میں مدرس ہوئے، اور نو سال تک جون پوران کی شمعِ وجود سے پُر نور رہا، ۱۲۸۴ھ میں ایک عالم کو شمامِ علم سے معطر فرما کر حیدر آباد میں وفات پائی،

انھی کے صاحبزادہ مولنا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں، زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد اور جد سے وراثت پائی، باندہ میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جون پور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، اور درس و تدریس شروع کیا، کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی معرکۃ الآراء کتابیں چھپوائیں، علماء سے مناظرے کئے، ان کی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطرافِ عالم میں پھیلی، اور سینکڑوں علمائے اعلام ان کی درسگاہ سے کامل ہو کر اٹھے، اور ملک ملک میں پھیلے، ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالمِ جاودانی کا سفر کیا، علماء کو مولانا کی ناگہانی وفات کا وہ صدمہ ہوا، کہ شمس العلماء مولنا سعید عظیم آبادی نے یہ تاریخِ وفات کہی،

شد فرنگی محل ز علم تہی

مولنا عبدالحی صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولنا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی، یہ ملا بحرالعلوم کے پوتے اور اپنے والد مولنا عبدالحلیم فرنگی محلی کے شاگرد تھے،

اخیر زمانہ میں مولنا عبدالباری فرنگی محلی اسی محفل کے چراغِ سحر تھے،

علمائے جونپور پورب کے دوسرے علمی مرکز جون پور کا نام بار بار آیا ہے، مگر ابھی تک وہاں کے اربابِ کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے، تیموری حملہ کے بعد سنہ ۸۰۹ھ میں جب جون پور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم وفضل کی مسند بھی بچھی، اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں، لیکن اس سے چند سال پہلے جونپور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفرآباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا،

علمائے ظفرآباد یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ظفرآباد شہزادۂ ظفرخاں کے نام پر بسا تھا، مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے، اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی، کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نے سنہ ۵۹۰ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کے ساتھ ملا مرتضیٰ کوفی ایک مردِ مجاہد بھی شریک تھا، اس وقت ظفرآباد کے مقام پر راجہ اودی پال نام ایک راجہ تھا، اس مجاہد نے راجہ سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا اور وہیں دفن ہوا، بعد کو مسجد ننگی "صحن شہیداں" کے نام سے مشہور ہوئی، اور اس وقت یہ مزار موضع شمس خاں پور کے رقبہ میں داخل ہے،[1]

مخدوم شیخ صدرالدین چراغِ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں سنہ ۶۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، یہ شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی سنہ ۷۳۵ھ کے مرید تھے، شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہِ وقت ان کے ہر اشارہ کی تعمیل کو عزت سمجھتے تھے،[2] شیخ صدرالدین پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفرآباد میں

قیام پذیر ہوئے، مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق نے اُن سے اپنی ایک بیٹی کا نکاح کر دیا تھا، اور ان کے لئے ظفر آباد میں ایک محل بنوایا تھا، جو "چراغِ ہند کے محل" کے نام سے ابتک مشہور ہے، اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہے[۱]،

بہ عہد ملک ذوالقرنین ثانی   بنائے شرع را از عدل بانی
غیاث الدین و دنیا بوالمظفر   سلیماں خاتم و جمشید افسر
شہ آفاق تغلق شاہِ اعظم   کہ بروی شد جہانداری مسلّم
برآمد ایں حصارِ چرخ ایواں   کہ در رفعت گذشت از فرق کیواں
دوشنبہ بست (و) ہشتم روز بودہ   ربیع الاوّلِ ماہِ ستودہ
ہمایوں ساعتے در وقتِ مسعود   ز ہجرت سال ہفصد بست و یک بود (۷۲۱ھ)
مظفر شد چو شد معمور ایں شہر   ظفر آباد نامش بودہ در دہر

اس کتبہ سے یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۰ ربیع الاوّل ۷۲۱ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو بسایا تھا[۲]،

چنانچہ اسی کے بعد سے ظفر آباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے، تاتاریوں کے حملہ کے زمانہ میں ایک بزرگ مع پنج صاحبزادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے، بعد کو ان کے ایک

۱؎ شاہانِ شرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم کلکٹر جونپور صفحہ ۱۰۵ ۲؎ اس مقام پر فرشتہ صفحہ ۱۲۹ اور مبارک شاہی صفحہ ۹۲ کی اس غلطی کو دور کرتا ہے کہ انھوں نے غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۱ھ لکھی ہے، مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہے، اور صحیح وہ ہے جو فیروز شاہی صفحہ ۴۲۵ میں ضیاء برنی نے اور تاریخ بدایونی صفحہ ۲۲۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے، یعنی ۷۲۰ھ،

صاحبزادہ سید تاج الدین کڑہ کے ناظم مقرر ہوئے، اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفرآباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا، اور "مخدوم آفتاب ہند ظفرآبادی" کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۷۹۳ھ میں وفات پائی، ان کا مزار اور انکی اولاد ابتک ظفرآباد میں ہے،

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا، اور دلّی جاکر تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میر منشی مقرر ہوئے، اور آخر میں ترکِ منصب کرکے حضرت نظام الاولیاءؒ کے حلقہ میں آئے، دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی یادگار چھوڑا،[1]

پورب میں علمی ترقی کے چار دور

پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں، ایک سلطنت[2] شرقی کا عہد دوسرا لودیوں کا، تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہ جہاں اور عالمگیر کا زمانہ، اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر،

شرقی سلطنت کا دور

پہلا دور ۷۹۶ھ سے شروع ہوکر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے، اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے،

یہ عہدِ حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا، قنوج سے لیکر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں، قصبوں میں قاضیوں، مفتیوں

---

[1] تجلی نور نور الدین ظفرآبادی جلد دوم ص ۹
[2] سلاطینِ شرق کے نام اور زمانے یہ ہیں:-

۱- سلطان الشرق خواجہ جہاں، ۷۹۶ھ - ۸۰۲ھ	۴- سلطان محمود شرقی، ۸۴۴ھ - ۸۶۲ھ
۲- مبارک شاہ شرقی، ۸۰۲ھ - ۸۰۴ھ	۵- سلطان محمد شاہ شرقی، ۸۶۲ھ - ۸۶۲ھ
۳- سلطان ابراہیم شرقی، ۸۰۴ھ - ۸۴۴ھ	۶- سلطان حسین شاہ شرقی، ۸۶۲ھ - ۸۸۱ھ

اور شیوخِ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جارہی تھیں، اور ہر جگہ علم وفضل کی مسندین بچھی تھیں، اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اُس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آجارہے تھے، آج بھی ان اطراف میں شرفاء کے جو خاندان آباد ہیں، ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں، اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انہی شرقی بادشاہوں کا فیض ہے، یا پھر آخر میں سلطان عالمگیر کے عطیے ہیں، سادات اور صدیقی، فاروقی اور انصاری شیوخ کی نو آبادیاں قنوج سے لیکر جون پور سے گذر کر غازی پور تک پھیلی تھیں، خانقاہیں اللہ والوں سے، اور درسگاہیں علم کے طلبگاروں سے بھری پڑی تھیں، شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفر آباد اور جون پور کے درو دیوار کو پُر نور بنا دیا تھا، علماء اور اہلِ ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ نور الدین ابی محمد بن مخدوم سید اسد الدین المتوفی ۸۲۶ھ،

۲۔ قطب الدین ابوالغیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ۸۶۹ھ میں وفات پائی،

۳۔ ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفر آباد المتوفی ۸۳۹ھ،

۴۔ قاضی تاج الدین ناصحی ظفر آباد المتوفی ۸۳۱ھ،

۵۔ قاضی نصیر الدین گنبدی قاضی جون پور، شاگرد قاضی عبد المقتدر دہلوی، المتوفی ۸۱۰ھ،

۶۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، دنیا بادشاہانِ اسلام کی اس علمی قدر دانی کو یاد رکھے تو اچھا ہے، کہ ملک العلماء جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا، مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لیکر مولانا کے سر پر پھرا کر یہ دعا مانگی کہ خداوندا

یہ بلاان سے دور کرکے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما، آخر دونوں آگے پیچھے ۸۴۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے،

۷ - ملا شیخ عبد الملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی، شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی المتوفی ۸۹۷ھ،

۸ - ملا علاء الدین عطا ملک برادر شیخ عبد الملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی، قاضی صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں اپنے اس شاگرد کا ذکر کیا ہے، کہ اسی کے پاس خاطر سے یہ لکھی گئی،

۹ - شاہ ابو الفتح جون پوری نبیرہ قاضی عبد المقتدر دہلوی، المتوفی ۸۵۰ھ،

۱۰ - شیخ محمد عیسیٰ جون پوری شاگرد قاضی دولت آبادی،

۱۱ - قاضی سماء الدین قتلغ خاں وزیر سلطان شرقی المتوفی ۸۳۰ھ،

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر آباد اور جون پور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علماء اور مشائخ اپنی درسگاہیں اور خانقاہیں اور شرفاء اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے، چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ فراز کندوری المتوفی ۸۲۹ھ، شیخ قوام الدین المتوفی ۸۴۰ھ، شیخ سارنگ المتوفی ۸۴۷ھ، شیخ محمد اعظم لکھنوی، شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی ۸۱۰ھ، شیخ ضیا لکھنوی شاہ ضیاء المتوفی ۸۴۰ھ، خیرآباد میں شیخ سعد الدین خیرآبادی المتوفی ۸۳۰ھ، ردولی میں مخدوم احمد عبد الحق المتوفی ۸۳۷ھ، شیخ امین الدین المتوفی ۸۳۷ھ، شیخ صفی الدین، اُن کے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابو المکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ، کچھوچھہ (فیض آباد) مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ، دریاباد میں شیخ محمد مخدوم آنکش المتوفی ۸۴۰ھ، اور اجودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ تعلیم وارشاد کی

مسندوں پر جلوہ آرا تھے،

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب دولت آبادی کے نام ملتا ہے، جس میں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارشِ خیر کا تذکرہ ہے،[1] شیخ سعد الدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر سماء الدین قتلغ خان کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے، شیخ کے صاحبزادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات[2] میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہے، جس میں شیخ سعد الدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال لکھا ہے، سماء الدین قتلغ خاں گو وزیر تھے، مگر اپنے زمانہ کے مشہور علما میں تھے،

لودیوں کا زمانہ اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور و نخوت سے ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، مگر خوش قسمتی سے اس وقت لودیوں[3] کا جو خاندان دلی کے تخت پر فرمانروا تھا وہ علم و فن اور فضل و کمال کا پورا قدر شناس تھا، ان کے زمانہ میں ہندوستان نے علم و تہذیب اور صنعت و زراعت کے کاموں میں بڑی ترقی کی، بلکہ شرقی بادشاہوں نے اس سرزمین میں تہذیب و تمدن کے جو پودے لگائے تھے وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بارآور ہوئے، غازیپور میں پھول اور پھل لگائے گئے، سکندرپور (بلیا) سلطان سکندر لودی کی آبیاری سے چنبیلی (وہاں کے قلعہ کی چنبیلی اب تک مشہور ہے) اور گلابوں کا تختہ بن گیا، جون پور ان پھولوں کے تیلوں اور عطروں سے مشامِ جان کو معطر کرنے لگا، اور اب تک کر رہا ہے، یہی عطر بیزی علمی میدانوں میں بھی ہوئی، یعنی

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۶ [2] نسخہ دار المصنفین [3] لودی پٹھانوں کی سلطنت ۸۵۵ھ سے ۹۳۲ھ تک دلی میں قائم رہی، ۹۳۲ھ میں بابر نے آکر لودیوں کا خاتمہ کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی، لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں:-

۱- سلطان بہلول لودی، ۸۵۵ھ — ۸۹۴ھ
۲- سلطان سکندر لودی، ۸۹۴ھ — ۹۲۳ھ
۳- سلطان ابراہیم لودی، ۹۲۳ھ — ۹۳۲ھ

علم وفن کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہار آئی، تیموری بادصرصر نے جن پودوں کو مرجھا دیا تھا، ان میں دوبارہ جان پڑی، اور دتی سے لیکر جونپور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے، ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا،

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا، غرض اس نے اطراف و دیار سے علماء کو جمع کیا، اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا[۱]، خود شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا، اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں، جنھوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی، اور ملا جامی کی صحبت سے جام فیض پیا تھا، اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آنکلے، شیخ عبداللہ تلنبی[۲]، اور شیخ عزیزاللہ تلنبی، پہلے نے دہلی کو، اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا، ملا بدایونی لکھتے ہیں، "واز جملہ علماے کبار در زمانِ سلطان سکندر شیخ عبداللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیزاللہ تلنبی در سنبھل بودند، وایں ہر دو عزیز ہنگامِ خرابی ملتان بہ ہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند، وقبل از یں غیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق وکلام درہند شائع نہ بود[۳]" ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے سُن کر کہتے ہیں کہ ایک شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علماے متبحر پڑھ کر نکلے[۴]، سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا، اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس میں شاہی آداب و تکلفات سے خلل نہ پڑے چپکے سے صفِ پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا، اور آخر میں سلام مسنون کرکے رخصت ہوجاتا تھا[۵]۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی،

---

[۱] دیباچہ اخبار الاخیار شیخ دہلوی ص۹ مطبوعہ احمدی مطبع دہلی ۱۲۷۰ھ [۲] یہ تلنبہ ملتان میں ایک گاؤں تھا، [۳] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [۴] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [۵] ایضاً،

پورب میں ان دونوں عزیزوں کی درسگاہ سے دو کامل نکلے، ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے ملا الہداد جونپوری المتوفی ۹۶۲ھ، پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا، اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا، اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے فقہ میں ہدایہ کی، نحو میں کافیہ کی شرحیں، اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا،

مولنا الہداد جونپوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو شرقیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی، پورب مولنا الہداد کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا، جون پور کے محلہ رضوی خاں میں مولنا کی درسگاہ تھی، مگراب نشان تک نہیں، ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری جونپوری تھے، سلطان سکندر کا عہد پایا تھا،

سکندر لودی کے زمانہ میں عرب سے ایک اور خضر طریقت کا ورود ہندوستان میں ہوا، یہ سید رفیع الدین محدث شیرازی ہیں، یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوانی کے، اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے ۹۵۴ھ میں وفات پائی، ان کی ذات معقول و منقول دونوں کا مرج البحرین تھی،

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب ذیل اکابر کے وجود سے فیضیاب تھی،

۱۔ شیخ معروف چشتی جونپوری مرید مولنا الہداد جون پوری،

۲۔ شیخ دانیال جونپوری استاد سید محمد جون پوری،

۳۔ شاہ ٹھمن غازی پوری میر عدل غازیپور المتوفی ۹۰۵ھ،

۴۔ سید محمد جون پوری، المتوفی ۹۱۰ھ،

۵- شیخ حسن بن طاہر بہاری جونپوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہی،

۶- شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جون پوری، المتوفی ۹۴۴ھ دہلی میں دفن ہوے،

۷- قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری، نبیرہ قاضی نظام الدین کیکلانی،

تیموریوں کا زمانہ ۹۲۳ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا، علم وفن نے ملک میں وسعت پائی، سلاطین اور امراء کی قدردانیوں نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی، اس عہد میں سید عبدالاول جون پوری ذکر کے قابل ہیں، جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، قاضی صلاح الدین خلیل کے شاگرد تھے اور غالباً حدیث کا فیض گجرات اور عرب کے سفر سے لائے، بیرم خان خاناں کی دعوت پر دہلی آئے، اور آخر وہیں کی خاک ان کی ابدی خوابگاہ ہوئی، ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے،

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفرآبادی ہیں، شیخ حسن بن طاہر سے فیضِ علم پایا، ہمایوں نے ہرچند چاہا کہ وہ اس کی نذر قبول فرمائیں، مگر دستِ قناعت شرمندۂ احسان نہ ہو سکا، ۹۷۰ھ وفات کا سال ہے،

تیموری عہد کا شباب شاہجہاں کا زمانہ ہی، پورب کی سرزمین اس زمانہ میں علم وفن کے ستاروں کی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی، ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت استاد الملک ملا محمد افضل جونپوری کو حاصل تھی، ان کے پدر بزرگوار دماوند سے چل کر ہندوستان آئے اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت خطۂ پورب کو حاصل ہوئی، وہ ردولی میں مفتی مقرر ہوے، ۹۷۷ھ میں یہیں ملا محمد افضل کی پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر پچھم کا رُخ کیا، دہلی پہنچکر ملا شیخ حسین شاگرد ملا طاہر لاہوری

سے فن کی کتابیں پڑھیں، اور حدیث کا درس ملا ابو حنیفہ شاگرد مخدوم الملک و حکیم علی گیلانی سے لیا، علوم وفنون کی تکمیل کے بعد جون پور کو اپنے فیض و برکات کا مرکز بنایا، اس درسگاہ کے فیض نے جونپور کو دار العلم بنادیا اور شاہجہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوادیا جو ابد تک یادگار رہیگا،

"پورب شیراز ماست"

اس مطلع علم سے جو علمائے وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبدالرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علمائے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے دیوان عبدالرشید وہ ہیں، جنھوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے شاہجہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا، ملا محمود نے دنیا کو فلسفہ میں شمس بازغہ، اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں دیں، پہلے شاہجہاں کے دربار میں تھے، پھر ایک درویش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سُنکر جون پور میں درسگاہ جاکر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے،

استاد الملک کے دوسرے شاگرد ملا ضیاء الدین محدث، شیخ چندن محدث اور ملا شیخ احمد زین زاہد المتوفی ۹۶۳ھ ہیں، استاد الملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ اُن کے بھائی شیخ محمود، اُن کے بیٹے شیخ حامد، اُن کے بیٹے ملا محمد یوسف، ان کے پوتے شیخ احمد اور اُن کے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں قاضی کوڑہ جہان آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیئے سے دیا جلاتے رہے،

عہد شاہجہانی و عالمگیری میں قاضی محمد حسین جونپوری (جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں سے ایک ہیں) ملا محمود ثانی جونپوری شاگرد دانشمند خاں، شیخ محمد ماہ جونپوری، شیخ شمس الدین جونپوری،

تجلی نور ص ۹۴
ایضاً ص ۵۵
"

ملا نورالدین جونپوری اور آخری دور میں ملا باب اللہ جونپوری، شیخ محمد افضل سید پوری (غازیپوری) الہ آبادی، علم و فن کے نامور فرمانروا گذرے،

عالمگیر کے زمانہ میں سہالی کا آفتاب بلند ہوا یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اور ان کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محب اللہ صدر پوری الہ آبادی، قاضی آصف صدر پوری الہ آبادی ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ ممتاز ہوے، جن کے بدولت اودھ کے حدود سے لیکر بہار کی اخیر سرحد تک علم و فن اور فضل و کمال کی بہار پھیلی تھی۔

غرض اس وقت شاہجہاں اور عالمگیر کی فیاضی اور علمی قدردانی کے بدولت قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک میں علما، اور مدرسین پھیلے تھے، بادشاہوں کی طرف سے اُن کو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں جسکے سبب سے وہ بے نیاز ہو کر علم و فن کی خدمت میں لگے تھے، ان میں کچھ ایسے مستغنی بھی تھے جنھوں نے یہ دردِ سر نہیں خریدا، اور اپنا سارا کاروبار خدا کے لئے کرتے رہے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب جگہ جگہ نوابیاں قائم ہو گئی تھیں، پورب کے جو قصبے اپنی مردم خیزی میں نامور ہوے اُن کے نام ترتیب سے یہ ہیں، بدآیوں، امروہہ، سنبھل، مرادآباد، رامپور، بریلی، شاہجہاں پور، فرخ آباد، قنوج، شمس آباد، سندیلہ، بلگرام، خیرآباد، صدر پور، ملیح آباد، کاکوری، نصیر آباد (رائے بریلی) ولکھنو، مالک پور، سلون، الہ آباد، اور خاص پورب میں جونپور غازی پور، سید پور، گھوسی، بھیرا، چریا کوٹ، شمس پور، متوپور وغیرہ،

جون پور کے مدرسے ملک العلما شہاب الدین دولت آبادی کے عہد سے لیکر اخیر زمانہ تک جون پور میں جو درسگاہیں علماے مدرسین کے زیر اہتمام عہد بہ عہد قائم ہوتی رہیں، ریاض[1] جون پور کے مصنف نے اپنی کتاب

[1] مؤلفہ سید محمد مہدی جون پوری، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۱ء،

کے آخر میں اس کی حسب ذیل فہرست دی ہی، اور لکھا ہی کہ محمد شاہ کے زمانہ تک وہ قائم تھیں،

۱- مدرسہ ملک العلما رقاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۹ھ،

۲- مدرسہ مولانا الٰہداد المتوفی ۹۲۳ھ،

۳- مدرسہ ملا محمود صاحب شمس بازغہ المتوفی ۱۰۶۲ھ،

۴- مدرسہ ملا عبد الباقی،

۵- مدرسہ ملا نور الدین،

۶- مدرسہ مفتی سید مبارک،

۷- مدرسہ ملا محمد حفیظ،

۸- مدرسہ ملا شیخ حامد،

۹- مدرسہ ملا شیخ محمد ماہ،

۱۰- مدرسہ ملا معمور، اکبر سے محمد شاہ تک،

۱۱- مدرسہ ملا محمد اعلیٰ " "

تجلی نور تاریخ جون پور کی تلاش سی چند مدرسوں کے نام اور معلوم ہوئے ہیں،

۱۲- مدرسہ میر محمد ملیح،

۱۳- مدرسہ ملا صدر جہاں ۱۱۹۰ھ،

۱۴- مدرسہ ملا شمس الدین، ۱۱۹۰ھ،

۱۵- مدرسہ حافظ غلام شاہ،

۱۶- مدرسہ میر محمد عسکری، ۱۱۱۹ھ،

۱۷- مدرسہ مولوی ثنار اللہ،

۱۸- مدرسہ مولوی عطار اللہ،

۱۹- مدرسہ سید ضیار الدین خاں،

۲۰- مدرسہ معین الدین حکاک،

۲۱- مدرسہ استاد الملک المتوفی ۱۰۶۲ھ،

۲۲- مدرسہ شیخ رکن الدین " ۱۱۲۱ھ،

۲۳- مدرسہ ملا عبد الباری خضری " ۱۰۳۶ھ

۲۴- مدرسہ خانقاہ مداریہ، ملا مداری " ۱۰۷۶ھ

۲۵- مدرسہ ملا شمس پور، " ۱۰۴۷ھ،

۲۶- مدرسہ ملا شیخ محمد صادق، " ۱۰۶۴ھ،

۲۷- مدرسہ ملا خلیل " ۱۰۷۹ھ،

۲۸- مدرسہ ملا باب اللہ،

۲۹- مدرسہ ملا جمیل " ۱۱۲۳ھ

اودھ کی نوابی کا زمانہ

تیموریوں کے اخیر دور میں لکھنؤ میں شیوخ نے طاقت پالی تھی، عالمگیر کے زمانہ میں فدائی خاں یہاں کے حاکم تھے، ان کے بعد شیوخ میں سے نواب ابو المکارم خاں نے جن کے نام سے لکھنؤ میں مکارم نگر کا محلہ آباد ہے، لکھنؤ کی حکومت پائی، مگر رعایا ان کی سخت گیری سے چیخ اٹھی یہی وہ وقت ہے کہ محمد شاہ کی کے زمانہ میں برہان الملک[1] سعادت خاں (المتوفی سنہ ۱۱۵۱ھ) نے سنہ ۱۱۳۶ھ میں اودھ کی صوبہ داری پائی وہ مذہبًا شیعہ تھا، اس نے اپنے صوبہ میں بہت سی علمی خاندانوں کی جاگیریں، معافیاں اور وظیفے ضبط کر لیے، نتیجہ یہ ہوا، کہ اکثر خاندان جو درس و تدریس اور علم کی اشاعت میں مصروف تھے، نوکری اور سپاہ گری کی خدمت پر مجبور ہوے، برہان الملک کے بعد اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا، سنہ ۱۱۵۹ھ میں الٰہ آباد کا صوبہ بھی اسی کے سپرد ہوا، جس میں جون پور وغیرہ قصبات داخل تھے، نواب نے یہاں کے علماء اور شرفا کی جاگیریں اور معافیاں بھی ضبط کیں، اور اہلِ علم کے خاندان تباہ حال ہو گئے، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں:- "برملتفتانِ ایں اوراق وحقائق جویانِ انفس وآفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و علما است، سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیا، کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی است قدس سرہ، می گوید کہ "مولٰنا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولٰنا علاء الدین نیلی اودی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف بود،

---

[1] نوابانِ اودھ کا سلسلۂ حکومت یہ ہے:-

۱- برہان الملک سعادت خاں، سنہ ۱۱۳۶ھ - سنہ ۱۱۵۲ھ (۱۷۲۲ء - ۱۷۳۹ء)
۲- ابو المنصور خاں صفدر جنگ، سنہ ۱۱۵۲ھ - سنہ ۱۱۶۷ھ
۳- نواب شجاع الدولہ، سنہ ۱۱۶۷ھ - سنہ ۱۱۸۸ھ
۴- آصف الدولہ یحییٰ خاں، سنہ ۱۱۸۸ھ - سنہ ۱۲۱۲ھ
۵- نواب سعادت علی خاں، سنہ ۱۲۱۲ھ - سنہ ۱۲۲۹ھ (۱۷۹۷ء - ۱۸۱۳ء)
۶- نواب غازی الدین حیدر، سنہ ۱۲۲۹ھ - سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۱۳ء - ۱۸۲۷ء)
۷- نصیر الدین حیدر، سنہ ۱۲۴۳ھ - سنہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء)
۸- محمد علی شاہ، سنہ ۱۲۵۳ھ - سنہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۳۷ء - ۱۸۴۲ء)
۹- امجد علی شاہ، سنہ ۱۲۵۸ھ - سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۲ء - ۱۸۴۶ء)
۱۰- واجد علی شاہ، سنہ ۱۲۶۳ھ - سنہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۴۶ء - ۱۸۵۹ء)

و مولنا شمس الدین یحیی و دیگر علماے اودھ سامع بودند" ترجمۂ مولنا شمس الدین یحیی در اوائل ایں فصل گذشت، اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند سیما حصار پاے تخت خلافت کہ بہ واسطۂ مرجعیت صاحب کمالاں ہر قسم در آنجا فراہم می آیند، و از تراکم افکار و اجتماع عقول اہل ہر عصر کمالات نفس ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی و چہ غیر آں بہ پایۂ بالاتر می رسانند، اما صوبۂ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ تمام صوبۂ اودھ و اکثر صوبۂ الہ آباد بہ فاصلۂ پنج کروہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفاؤ نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند، و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ، و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بہ روے دانش پژوہاں کشادہ، و صلاے اطلبوا العلم در دادہ، و طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحب توفیقاں ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند، و خدمت ایں جماعہ را سعادت عظمی می دانند، صاحبقران ثانی شاہجہاں انار اللہ برہانہ می گفت، "پورب شیراز مملکت ماست" و تا حدود سنہ ۱۱۳۰ ثلثین و مایۃ و الف ہنگام علم و علما دریں گل زمین گرمی داشت تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، و اکثر بلاد عمدۂ صوبۂ الہ آباد نیز مثل دار الخیور جون پور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہان آباد و غیرہا ضمیمۂ حکومت گردید، و وظائف و سیور غالات خانوادہاے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد، و کار شرفاؤ نجبا بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بہ آں درجہ نماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ہاے ارباب کمال بیشتر برہم خورد انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ و بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہرزادۂ او ابو المنصور خاں صفدر جنگ رسید و وظائف و اقطاعات بہ دستور زیر ضبط ماند، و در اواخر عہد محمد شاہ سنہ ۱۱۵۹ تسع و خمسین و مایۃ و الف صوبہ داری الہ آباد

نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد، و تتمۂ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفتِ ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار بر ارباب وظائف تنگ تر گرفت، و تا حین تحریر کتاب ایں دیار پامالِ حوادثِ روزگار است، لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا، باوجود ایں خرابیہا رواجِ علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ اینجا است در قلمروِ ہندوستان ہیچ جانیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طرازند، و بہ وصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز، مصرع

"با صد جہاں کدورت باز ایں خرابہ جائے است"

(مآثر الکرام آزاد ص۲۲۱)

بنگالی مورخ مسٹر لا اپنی کتاب "ترقی تعلیم ہند بہ عہد مسلمانان" میں لکھتا ہے:-

"تذکرۃ العلماء، اور سیر الملوک میں جن کے اقتباسات تذکرہ میں موجود ہیں، اس شہر کے متعلق دلچسپ تفصیلات ہیں، جن سے نہ صرف وہاں کے علماء اور طلبہ کی نجی زندگی، بلکہ دوسرے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی، ہندوستان کے تمام حصے خصوصاً صوبہ اودھ اور الٰہ آباد کے لوگ یہاں تحصیلِ علم کے لئے جمع ہوتے تھے، سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں یہ شہر اس کا پایہ تخت ہوا، اس وقت یہاں سینکڑوں مدرسے اور مسجدیں تھیں، طلبہ اور اساتذہ کو جاگیریں ملتی تھیں، تاکہ وہ تمام مادی ضرورتوں سے بے فکر ہو کر علم و فن میں مشغول رہیں، ہمایوں کی حکومت میں بھی جون پور علم و فن کے مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا، اس کی شہرت جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی قائم رہی، شاہجہاں نے تو اس کو شیرازِ ہند کا نام عطا کیا، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد تک یہ دستور تھا، کہ دہلی کے فرمانروا جونپور کے حاکم کے پاس برابر فرامین بھیجا کرتے تھے کہ وہ شہر کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، جون پور کے واقعہ نگار ہر مدرسہ کی روداد احتیاط سے مرتب کیا کرتے تھے، اگر روداد سے کسی مدرسہ کی

کوئی احتیاج معلوم ہوتی تو امداد دی جاتی، شہزادے اور امرا جب اس شہر سے گذرتے تو یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کرتے اور سلاطینِ دہلی کو خوش کرنے کے لئے ان کو عطیے دیتے، ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جون پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، ایک بار وہ اس شہر میں آیا، لیکن یہاں کے علما اس سے ملنے نہیں آئے، جس سے اس نے اپنی اہانت محسوس کی، انتقاماً اس نے ان کی تمام جاگیریں اور وظائف ضبط کر لینے کا حکم جاری کر دیا، حکم کی تعمیل ہوئی جس کے بعد سے جون پور پر ادبار آگیا، طلبہ اور اساتذہ منتشر اور مدرسے خالی ہو گئے، ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۴ء) میں نواب آصف الدولہ نے مختار الدولہ کی مرضی کے مطابق ان جاگیروں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن ایلچ خاں نے احتجاج کیا، اسی زمانہ میں جون پور انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔"

(پروموشن آف محمڈن لرننگ انڈ، ان، ان، لا، ص ۱۰۲-۳-۱۰۴)

اس کے بعد ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے حوالہ سے وہ کہتا ہے:-

"وارن ہیسٹنگز نے شاید اس شہر کا معاینہ کیا تھا، سرائر کوٹ تو اس شہر میں ضرور آیا، ۱۷۸۰ء میں ڈنکن کی آمد کا ذکر رو داد (PROCEEDINGS) کی ان جلدوں میں موجود ہے، جو بنارس کے کلکٹر اور کمشنر کے کاغذات کی الماریوں میں سڑ گل رہی ہیں، وہ اس شہر کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتا ہے، اس کے زوال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ یہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور ارباب علم کا مستقر تھا، اسی لئے اس کو ہندوستان کا شیراز کہتے تھے،

یہاں کے مدارس کی گذشتہ شہرت کے قصوں کے سوا، اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے، لیکن مسٹر ڈنکن کے مذکورۂ بالا بیان کے علاوہ اور بھی بہتر اسباب موجود ہیں، جس کی بنا پر ہم اس شہر کو ہندوستان کا شیراز یا ازمنۂ وسطیٰ کا پیرس کہہ سکتے ہیں، فیروز شاہ نے اپنے بھائی کی شہرت اور عظمت کے مطابق اس کو علوم و فنون کا مرکز بنانا چاہا،

جون پور کے ہر حکمراں نے فنون کی سرپرستی کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھا، چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شاہی پایۂ تخت میں جب ہنگامے شروع ہوئے تو شہر کے علماء اور فضلا منتشر ہوگئے، اسی زمانہ میں جون پور کی پُرامن اور پرسکون فضا میں علوم وفنون کا فروغ ہوا، محمد شاہ کے عہد میں بھی جون پور میں ۲۰ مشہور مدارس تھے، اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، ان مدارس میں سے ایک کے بانی کا انتقال پندرہویں صدی کے وسط میں اور دوسرے کا سترہویں صدی کے وسط میں ہوا، یہاں صرف مدارس کے علوم ہی کا فروغ نہیں ہوا، بلکہ ابراہیم اور حسین کی مساجد حسن تعمیر کی ترقی کی بھی شہادت دیتی ہیں۔"

(دارکیا لوجیکل سروے آف انڈیا جلد اوّل (جونپور کی شرقی تعمیرات) از فوہرر (۱۸۸۹ء) ص ۲۱-۲۲)

بہر حال ان سیاسی و مذہبی حوادث کے طوفان میں بھی علم وفضل کی وہ شمعیں روشن رہیں جنکی روشنی شاہانہ عنایتوں کے چشمۂ نور سے مستعار نہ تھی، اس زمانہ میں پورب کا خطہ اور خصوصیت کے ساتھ جون پور اور غازیپور کے اطراف میں ایسی ممتاز ہستیاں تھیں جن کے بوریائے فقر کی بلندی مسند شاہی سے کم نہ تھی، جیسے مولنا محمد احسن چریا کوٹی شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ابو الغوث گرم دیوان ساکن بھیرا (اعظم گڈھ) المتوفی ۱۱۷۰ھ و مولنا شاہ محمد علی بھیروی نبیرۂ شاہ ابو الغوث گرم دیوان (اعظم گڈھ) شاگرد ملا بحر العلوم، ملا باب اللہ جون پوری شاگرد ملا احمد اللہ سندیلوی، شاہ نثار علی جونپوری المتوفی ۱۲۱۵ھ شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی، مولوی کرامت اللہ چریا کوٹی شاگرد میر عسکری جونپوری و ملا حمد اللہ سندیلوی، شاہ محمد افضل غازیپوری الہ آبادی المتوفی ۱۱۲۴ھ، ملا محمد ماہ دیوگامی (اعظم گڈھ) شاگرد ملا رکن الدین بہریابادی و دیوان عبد الرشید جون پوری، قاضی خوب اللہ جونپوری المتوفی ۱۱۰۰ھ، قاضی حسن سعید خاں جونپوری المتوفی ۱۱۵۷ھ، مولنا میر محمد عسکری شیعی المتوفی ۱۱۱۹ھ، مولوی عبد القادر

سوگھر پوری (اعظم گڈہ) المتوفی ۱۲۱۲؁ھ مولنٰنا غلام حسین جون پوری مصنف جامع بہادر خانی المتوفی ۱۲۰۵؁ھ، ملا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ (ساکن اٹاوہ پرگنہ منڈیاہو ضلع جون پور) وغیرہ،

دلی کے آخری خانوادۂ علم کا اثر پورب پر

آخری زمانہ میں جب دلّی میں تیموریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا اور دلوں میں علم و فن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا، دلّی کے خانوادہ میں اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ المتوفی ۱۱۷۶؁ھ کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز صاحب المتوفی ۱۲۳۹؁ھ اور اُن کے بھائیوں اور عزیزوں کا دور تھا، دور دور سے طلبہ دلّی آتے تھے اور عقل و نقل کے چشموں سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ معقولات میں میرزاہد ہروی کا اور حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے واسطہ سے مدینہ منورہ کے علماء اور محدثین سے فیضیاب تھا، اور مرج البحرین کا یہی رنگ نکھر کر ان کے اخلاف میں نمایاں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب (۱۲۴۲؁ھ) شاہ رفیع الدین صاحب (۱۲۴۹؁ھ) شاہ عبدالغنی صاحب، اور اُن کے اخلاف میں شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲؁ھ نواسۂ شاہ عبدالعزیز صاحب، اور مجددی خاندان کے ایک اور بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کے دم سے نئی رونق پیدا ہوئی، اور وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ اُن تمام بدعات و خرافات کے داغ سے پاک ہو، جو جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے پیدا ہو گیا تھا، تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں شاہ صاحب کے خاندان میں دو نئے مجتہد الوقت پیدا ہوئے، مولنٰنا اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی (۱۲۴۶؁ھ) اور مولنٰنا عبدالحیٔ صاحب دہلوی

مولنٰنا شاہ اسمٰعیل، شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے اور شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحیٔ

صاحب المتوفی ۱۲۴۳ھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور امام الزماں مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید اور داعی تھے،

اس دو آتشہ تحریک نے جو عوام میں وہابیت کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں میں مراسم شرک غیر شرعی رسم و رواج اور بدعات کے مٹانے میں بڑا کام کیا، ان بزرگوں کے شاگرد اور شاگرد کے شاگرد سارے ملک میں پھیل رہے تھے جس سے پورب کا خطہ خاص طور سے متاثر تھا، خاص جون پور اور اس کے اطراف میں متعدد بزرگ اس نیک کام میں لگے ہوئے تھے،

۱۔ مولوی کرامت علی جون پوری نے اپنے لئے بنگال کے علاقہ کو پسند کیا، اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام اُن سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، در فقہ میں مفتاح الجنۃ ان کی مشہور کتاب ہے ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی، اس خاندان کے اخلاف نسلاً بعد نسلٍ اب تک اس فرض کو کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں،

۲۔ مولانا محمد فصیح صاحب غازی پوری جو شاہ افضل سید پوری غازیپوری الٰہ آبادی کے پڑپوتے تھے، بنارس میں حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید صاحب سے فیض حاصل کیا، بہار، بنارس، اور اعظم گڈہ وغیرہ میں ان کے ذریعہ دین کی خدمت ہوئی، ۱۲۸۵ھ مین وفات پائی، شاہ اما نت اللہ صاحب فصیحی غازی پوری اُن کے بیٹے اور شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازیپوری اُن کے پوتے تھے،

۳۔ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری، منڈیاہو ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، حضرت شیخ محمد کونی ظفرآبادی کی اولاد میں تھے، مولنا فضل رسول صاحب بدایونی اور مولنا احمد اللہ انامی شاگرد مولنا شاہ اسحاق دہلوی اور دوسرے بزرگوں سے پڑھا، اور آخر مولنا اسمٰعیل شہید اور مولنا عبدالحئی صاحب

دہلوی سے علوم کی تکمیل کی، کچھ دنوں باندہ میں نواب باندہ کے ہاں رہے، آخر جونپور آکر طرحِ اقامت ڈالی، اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، کچھ دنوں کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور وہیں حج و زیارت کے بعد ۱۲۷۴ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی،

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ بابرکات سے پورب کے خطہ میں بڑا فیض پھیلایا، سینکڑوں علما آپ کے درس سے کامل ہو کر نکلے، اور دور دور تک دین کے اثر کو وسیع کیا، بدعات کو مٹایا، اور علمِ دین کو رواج بخشا، اس بابرکت فیض سے اعظم گڈہ کے اس طبقہ میں بھی جس میں اب تک عربی اور مذہبی تعلیم کا رواج نہ تھا (یعنی اعظم گڈہ کی نومسلم برادری) عربی تعلیم کا خیال پیدا ہوا، اور آپ ہی کی تحریک سے جونپور میں منشی امام بخش صاحب نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر آگے آتا ہے،

اُن کے مشاہیر تلامذہ میں حسب ذیل نام قابلِ ذکر ہیں، مولٰنا خواجہ احمد نصیر آبادی، مولٰنا رجب علی جونپوری، مولٰنا کرامت علی جونپوری، مولٰنا شیخ محمد مچھلی شہری، مولٰنا سید محمد یعقوب دیسنوی بہاری، مولٰنا مصطفیٰ اشیر بہاری مدرس مدرسۂ خانقاہ سہسرام، مولٰنا شجاعت حسین بہاری، مولٰنا ولی محمد صاحب سکروری (اعظم گڈہ) محمد عمر غازیپوری، مولٰنا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی (استاذ مولانا شبلی مرحوم) مولٰنا رحیم اللہ ساکن بستی وغیرہ،

اہلِ حدیث اور خالص حنفی

دہلی کے اس خانوادہ کے فیضِ تعلیم سے دو اہم سلسلے چلتے ہیں، ہندوستان میں اب تک ترکستان و خراسان کے اثر سے صرف فقہ حنفی کا رواج تھا، عرب سے خال خال شافعی آتے تھے، مگر ان کا اثر سواحل تک محدود تھا، اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جب سمندر کی طرف سے عربوں کی آمد و رفت کا دروازہ کھلا، تو ہندوستان اور عرب میں علمی تعلقات کا آغاز ہوا، چنانچہ شیخ بہلول حضرت

مجدد الف ثانی کے شیخ الحدیث) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس فیض کو وہیں سے لائے، اس سے حنفیت کے غلو کے ساتھ حدیث وسنت کی پیروی کا خیال دلوں میں پیدا ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے جب عرب کا سفر کیا، اور مختلف مذاہب کے علماء سے فیض پایا تو ان کا مشرب زیادہ وسیع ہو گیا، وہ عملاً گو حنفی ہی رہے، مگر نظری اور علمی حیثیت سے وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اس شان کا علانیہ جلوہ اُن کی مسوی و مصفی شروح موطا میں نظر آتا ہے، بانکی پور کے مشہور کتبخانہ میں صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ ہے جس پر شاہ صاحب کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنے کو عملاً حنفی اور علماً و تدریساً حنفی و شافعی لکھا ہے، اور اپنی بعض تالیفات میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کو ترجیح دی ہے جو فقہ حنفی کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب کے بعد یہ رنگ اور نکھر گیا، مولانا شاہ اسحاق صاحب، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحئی صاحب دہلوی نے ردِ بدعت اور توحید خالص کی اشاعت میں جو جد وجہد فرمائی، اُس نے دلوں میں سنت کی پیروی کا عقیدہ راسخ کر دیا، ان کے شاگردوں میں یہ دونوں رنگ الگ الگ ہو گئے، شاہ اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر اور مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری ہیں، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز شاگرد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ (بانی مدرسۂ دیوبند) ہیں، اور پورب میں مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کے شاگرد مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں ردِ بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا، مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے[2] شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب بہاری

---

[1] زبدۃ المقامات [2] مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی

دہلوی ہیں، اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلہ کا نام اہل حدیث مشہور ہوا

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا، اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علماء تھے،

مولنا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی، موصوف کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا، انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی، ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، پنجاب میں مولنا عبداللہ غزنوی، مولنا عبدالجبار غزنوی، مولنا محمد حسین بٹالوی، اور مولانا عبدالمنان وزیرآبادی وغیرہ، پورب کے خطہ میں مولنا امیر حسن سہسوانی، مولنا بشیر صاحب قنوجی، مولنا عبداللہ صاحب مئوی غازیپوری، مولنا شمس الحق صاحب ڈیانوی عظیم آبادی، مولنا محمد ابراہیم صاحب آروی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵) اہل حدیث و احناف میں ما بہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہلحدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولنا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے، عبارت یہ ہے: "و درہمیں سال (سنۃ الف و مائتین و تسع اربعین) حدیث شریف از مولنا محمد اسحاق مرحوم مغفور شروع فرمودند و صحیح بخاری و صحیح مسلم بشراکت مولوی محمد گل کابلی و مولوی عبداللہ سندھی و مولوی نوراللہ سروانی و حافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم حرفاً حرفاً خواندند و ہدایہ و جامع صغیر بمعیت مولوی بہاء الدین دکھنی و جد امجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی و نواب قطب الدین خاں دہلوی و قاری اکرام اللہ وغیرہم، و کنز العمال ملا علی متقی علحدہ شروع فرمودند و دو سہ جزو خواندند و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و موطا امام مالک تنہا بر مولنا ممدوح عرض نمودند و اجازۃ از شیخ الآفاق حاصل نمودند، البتہ شاہ صاحب سے سند و اجازت تحریری انھوں نے ۲ شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے، جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے،

مولنا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (دربھنگہ) مولنا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری اعظم گڈھی، اعظم گڈہ کے ضلع پر خصوصیت کیساتھ مولنا فیض اللہ صاحب مئوی شاگرد مولنا سخاوت علی صاحب جونپوری مولنا عبداللہ غازیپوری اور مولنا سلامت اللہ جیراجپوری کا زیادہ اثر پڑا، ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان تینوں فریقوں میں مدتوں مناظرہ کا بازار گرم رہا، یہی وہ مذہبی ماحول ہے جس میں مولنا شبلی مرحوم کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا،

پورب کے دو نئے مدرسے انگریزی عہد میں جب انگریزی عملداری شروع ہوئی تو پورب میں پھر سے نئے مدرسوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے بعض بعض نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے دو ذکر کے قابل ہیں، مدرسۂ اسلامیۂ امام بخش جون پور اور مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور،

مدرسہ اسلامیہ امام بخش جون پور جونپور میں منشی امام بخش ایک رئیس تھے، انگریزوں کی شروع عملداری میں جب سررشتہ داری بڑی اہمیت رکھتی تھی وہ غازیپور میں فوجداری کے سررشتہ دار تھے، اس سے بڑی نیک نامی اور دولت پیدا کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی تحریک سے غالباً ۱۲۶۱ھ میں انھوں نے جونپور میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، ۱۲۷۸ھ[1] میں انھوں نے اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ وقف کر دیا اور بقیہ جائداد اپنے بیٹے مولوی حیدر حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ کے سپرد کر کے ہجرت کے قصد سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، وہاں ایک ہی سال کے بعد ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی، انہی مولوی حیدر حسین کے فرزند و جانشین نواب عبدالمجید خاں بیرسٹر مرحوم تھے اور اب ان کے صاحبزادہ نواب سر محمد یوسف ہیں، مولوی حیدر حسین خاں نے اپنے والد کی وفات کے چودہ برس بعد ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا، مولوی

---

[1] القول الجلی فی تذکرہ سخاوت علی ص۲ مثنوی تذکرہ ہدی ص۹ جون پور،

حیدر حسین صاحب کے زمانہ میں پانچ سو ماہانہ مدرسہ کے مصارف کے لئے دیئے جاتے تھے، مدرسہ میں دو مدرس تھے، اور سو کے قریب طالب علم پڑھتے تھے[1]،

اس مدرسہ میں صدر مدرسی کی خدمت کے لئے مولنا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۶ھ میں فرنگی محل کے نامور عالم مولنا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کا انتخاب کیا، جو باندہ میں مولنا کے ساتھ رہتے تھے، اور جنھوں نے بہت کچھ مولنا سے کسب فیض[2] کیا تھا، موصوف نو برس تک یہاں مدرس رہے، مولنا عبد الحیٔ صاحب مرحوم فرنگی محلی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گذرا، ۱۲۷۶ھ میں مولنا عبد الحلیم صاحب لکھنؤ جا کر ۱۲۷۷ھ میں حیدر آباد گئے، اُن کی جگہ پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی جو مولنا عبد الحلیم صاحب کے استاد تھے، مدرسہ میں آئے، موصوف کے زمانہ میں مدرسہ کی دھوم دور دور پہنچی اور لائق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہوا، ان ہی میں مولنا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ہیں، جنھوں نے یہیں مفتی صاحب سے علوم و فنون کے سبق لئے، اور مشہور روزگار ہوئے، مفتی صاحب نے چند روز کے بعد حجاز کا سفر کیا، اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات[3] پائی، موصوف کے حواشی بر ملا حسن و میر زاہد کے چند نسخے دار المصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولنا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ ۱۲۷۳ھ ثبت ہیں۔

---

[1] ریاض جونپور ص ۵۲ [2] القول الجلی فی تذکرۃ مولنا سخاوت علی [3] مولنا فاروق صاحب نے ۱۲۸۶ھ میں اپنے استاد کی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی، اور اُن کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے،

دلم در شوقِ زلفش نالہ ساز است — چہ می نالم غمِ زلفش دراز است

آگے چل کر ہے:۔

جنابِ اوستاد کعبۂ جاہ — دلیلِ راہِ مردانِ حق آگاہ

چہ یوسف مصر معنی را عزیزے — نیر زد ملک جم پیشش بہ چیزے

ادب گیرد بہ بُستانش ارسطو — بہ پیشش بو علی تہ کرد زانو

(تاریخ علمائے ہند ص ۲۰۹)

اس مدرسہ کے آخری نامور مدرس مولٰنا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری شاگرد مولٰنا فضلِ حق خیرآبادی تھے، جن کے فضل و کمال کے آوازہ سے ابھی تک ہندوستان پُرشور ہے، ۱۸۶۷ء میں مدرس ہوئے ان کے لائق شاگردوں میں مولٰنا شیر علی صاحب، مولٰنا احسن صاحب بہاری، مولٰنا سلیمان اشرف صاحب بہاری، مولٰنا لطف الرحمان صاحب بردوانی وغیرہ تھے، مولٰنا شبلی نے بھی چند روز اُن سے پڑھا تھا، اور اُن سے راہ و رسم رکھتے تھے، ۱۹۰۶ء میں وفات پائی،

مولوی لطف الرحمان صاحب بردوانی ۱۸۸۲ء میں مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے، جب یہ خبر مولٰنا شبلی کو معلوم ہوئی تو اپنے ایک شاگرد کو جو جون پور میں پڑھتا تھا، اور جس نے یہ خبر دی تھی، لکھا "از نامہ ات بحال مدرسہ دلم بہ درد آمد کہ سپردون لطف الرحمان وغیرہ را بہ کار تعلیم و تعلّم گماشتہ است' آوخ از دستِ فلک کہ ہماں جاے افادتِ مفتی محمد یوسف صاحب' اکنوں ایں شعر بر زبانِ حال دارد،

از ہجومِ جغد در ویرانۂ ما جا نماند ۔۔۔ آں قدر آباد شد آخر کہ ما می خواستیم

(۵۔ نومبر ۱۸۸۲ء)

مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ غازیپور میں طلوع ہوا، نام مولٰنا رحمت اللہ صاحب تھا، جو چار واسطوں سے ملا قطب الدین سہالوی کے سلسلۂ اولاد میں تھے، اپنے چچا ملا ظہور اللہ سے تعلیم پاکر غازی پور میں قیام کیا، اور چشمۂ رحمت کے نام سے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اور درس و تدریس میں مصروف ہوے، ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، مشہور اردو شاعر شمشاد لکھنوی فرنگی محلی المتوفی ۱۹۱۷ء یہیں کے استاد تھے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی کے ایک نامۂ فارسی میں ہے، اس مدرسہ کے دوسرے مشہور استاد مولٰنا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اور مولٰنا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری دشاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی و مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی

ومولانا فاروق صاحب چریاکوٹی ومولٰنا نذیرحسین صاحب دہلوی) ہیں، ایک زمانہ میں اس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، پورب کے اچھے اچھے طلبہ نے یہاں پڑھ کر فراغ حاصل کیا اور فروغ پایا، مدرسہ اب تک چل رہا ہی، مگر اب اُس کی شہرت اگلی سی نہیں،

اعظم گڈہ اور اُسکے اطراف

اعظم گڈہ ایک نئی آبادی ہی، البتہ اُس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں، اور پہلے وہ جون پور میں شمار ہوتے تھے، اس لئے موجودہ ضلع اعظم گڈہ کے اکثر اگلے مشاہیر جون پوری مشہور ہوئے، اُس زمانہ میں سرکار جون پور کی وسعت آجکل سی مختلف تھی،

سرکار جون پور کا رقبہ اس موقع پر ایک اصطلاحی غلطی کا دور کرنا ضروری ہی، مغلوں کے زمانہ میں سرکاروں کی جو تقسیم تھی وہ موجودہ انگریزی تقسیم سی بالکل الگ تھی، آئین اکبری کے دیکھنے سی معلوم ہوتا ہی کہ اُس زمانہ میں سرکار جون پور کا رقبہ موجودہ فیض آباد کی سرحد سے لیکر موجودہ غازیپور کے حدود تک پھیلا تھا، جن کو آج کل اضلاعِ مشرقی کہتے ہیں، سرکار جون پور اس زمانہ میں ۴۱ محال یعنی پرگنوں پر منقسم تھی، ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام آئینِ اکبری میں گنائے گئے ہیں، اُن سی معلوم ہوتا ہی کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڈہ اور موجودہ ضلع بلیا کا پرگنہ سکندرپور، غازیپور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری، اور فیض آباد کے پرگنے چاندپور، بڑہر، ٹانڈہ اور سرہرپور سب سرکار جون پور میں داخل تھے یہی سبب ہی کہ ان مقامات کے اکابر اور مشاہیر باہر کی دنیا میں **جون پوری** ہوکر رونما ہوئے،

اعظم گڈہ اعظم گڈہ کا ضلع گو انگریزی عہد میں پیدا ہوا ہی، مگر اُس کا نام ونشان بہت پہلے سی ملتا ہے، اعظم گڈہ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں اکثر راجپوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہی،

دوسرا حصہ وہ ہی جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آبا رو اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کر کے یہاں آئے یا آباد ہوئے، اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہی،

اعظم گڈہ کے نومسلم خاندان نومسلم خاندانوں میں سے جو وقتاً فوقتاً اسلام کے خلعت سے سرفراز ہوتے رہے، دو قومیں پیدا ہوئیں، ایک وہ لوگ جو اپنی اصل ونسل میں بالکل خالص رہی، ان میں قابلِ ذکر اعظم گڈہ کے راجاؤں اور سدھاری متصل اعظم گڈہ کے بابوؤں کے خاندان ہیں، اور جو اب تک اسی طرح بے میل مسلمان راجپوت ہیں، دوسری قوم وہ ہے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگی، اُن کو عرفِ عام میں عام طور سے روتارہ کہتے ہیں، جو حقیقت میں اصل ہندی لفظ راوت کی خرابی ہی، یہ راوت کا لفظ پہلے راجپوتوں کے لئے بولا جاتا تھا، اور اب بھی کہیں کہیں بولا جاتا ہی، امیر خسرو دہلوی قران السعدین میں کہتے ہیں، ع راوتِ تز وبین زن وخاراشگاف" (ص۳۶ مطبوعہ علی گڈہ) مرہٹی میں راوت سوار سپاہی کو کہتے ہیں، اور وہ بہت سی خاندانوں کا سرنام ہے،

اعظم گڈہ گڈہ ہندی لفظ ہی جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جز گڈہ ہی، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا، یعنی کسی زمیندار یا رئیس نے اپنے اور اپنی رعایا کے لئے کوئی گڑھ بنایا، اور اُس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا، اعظم گڈہ بھی اسی قسم کا شہر ہی، راجہ اعظم جن کے نام کی طرف یہ نسبت ہی، اعظم گڈہ کے مسلمان راجپوت راجاؤں میں سے تھے، اس راجہ کا خاندان یہاں اب بھی موجود ہی، اور اس کا قلعہ عرفِ عام میں کوٹ (قلعہ) کہلاتا ہی، اور اس کے آس پاس کی آبادی کا نام محلہ کوٹ ہے،

اعظم گڈہ کا بانی روایت یہ ہی کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ آگرہ جا کر مسلمان ہو گیا،

جہانگیر نے اس کی بڑی قدر کی، اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا، اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ ۲۴ پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڈھ میں واقع تھے، تزک جہانگیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام ایک امیر کا ذکر موجود ہی شہنشاہ لکھتا ہی:- "دولت خاں بفوجداری صوبہ الٰہ آباد و سرکار جونپور تعین یافتہ بود آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد" (تزک جہانگیری جشن ہفتمیں نوروز)

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بطور یادگار باقی تھا، جس کی نقل شروع انگریزی عملداری میں شامل مسل ہوکر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں محفوظ ہے، اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:-

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شدہ، کہ ابھمن سنگھ زمیندار علیہ نظام آباد از بندۂ مقبول بارگاہ والاجاہ بدین اسلام درآمد، نظر براستحقاق بہ خطاب راجہ نادر دولت خاں ممتاز شدہ بست و دو پرگنہ از صوبہ الٰہ آباد ابتدا از نیساں خریف سخا قوئیل حسب الضمن مرحمت فرمودیم باید کہ فرزندان نامدار کامدار والاتبار و وزرائے ذوی الاقتدار و حکام کرام و عمال کفایت فرجام و متصدیان مہمات دیوانی و متکفلان معاملات سلطانی و جاگیرداران حال و استقبال ابداً و مؤبداً در استقرار و استمرار ایں حکم مقدس و معلّٰی کوشیدہ بر زمینداری پرگنات بہ خطاب مذکورہ نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ خالداً و مخلداً بحال و برقرار داشتہ بہ زرہائے مشخص مال واجب سرکار مبلغ یک لک و بست و پنجہزار روپیہ نانکسار بر قبولیت مجرا دادہ باشند کہ مع سرحد و سردیہہ وغیرہ ابواب زمینداری صرف معیشت خود پردازد و از تصادم تغیر و تبدیل ایں امر مقدس مصون و محروس دانستہ سند مجدد نہ طلبند از یرلیغ کرامت تبلیغ والا انحراف نہ دارند" (یازدہم شہر ربیع الآخر سنہ چہارم جلوس فقط)

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہی:- "بر کتاب حسب ضمنی بست و دو پرگنہ نانکسار[1] یک لک ۲۵ ہزار پرگنہ نظام آباد، پرگنہ کوڑیہ، پرگنہ تھمی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ چکیسر، پرگنہ نتھوپور،

[1] یا "نانکسار"؟

پرگنہ چریاکوٹ، پرگنہ قریات متھوپور، پرگنہ بلہابانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ مئوناتھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بہری آباد،
پرگنہ پچوتر، پرگنہ سیدپور بھتری، پرگنہ نلور آباد، پرگنہ بھوداؤں، ابواب زمینداری سی صدیک روپیہ،

یہ جن پرگنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڈہ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں،

راجہ دولت خاں مینھ نگر میں لاولد فوت ہوگئے، وہیں ان کی قبر ہے، وہ اپنے بعد اپنے ہندو بھتیجے ہربنس کو ریاست کا مالک بنا گئے تھے، آگے کے سلسلہ میں ایک نامور بکرماجیت نامی ہوا، جس نے پھر اسلام قبول کیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں اور عظمت خاں، اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڈہ کی بنیاد ڈالی، اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڈہ بسایا، جو اب تک اسی نام سے اسی ضلع میں آباد ہے،

جب سرکار جون پور میں اودھ کی نوابی قائم ہوئی، تو اعظم گڈہ کے راجوں اور اودھ کے نوابوں میں کئی دفعہ لڑائیاں ہوئیں،

عظمت خاں کے بیٹے مہابت خاں بڑے دبدبہ کے راجہ ہوئے، مدھوبن پرگنہ گھوسی سے لیکر پرگنہ اترولیا ضلع گورکھپور تک اُن کی حکومت قائم ہوئی، آخر نواب سعادت علی خاں سے لڑکر گورکھپور میں قید ہوئے، جہاں ۱۷۳۱ء میں وہ فوت ہوگئے، اُن کے بیٹے ارادت خاں نے صفدر جنگ نواب اودھ کے مقابلہ میں نواب احمد خاں بنگش والیِ فرخ آباد کی مدد کی،

۱۷۵۶ء میں ارادت خاں کی جگہ اُس کا بیٹا جہان خاں ریاست کا مالک بنا، لیکن ارادت خاں کے رہتے ہی جہان خاں کے چچا جہانگیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے ریاست پر قبضہ کرنا چاہا، اور آخر ناکام رہ کر جون پور میں پناہ لی، جہان خاں اور نواب اودھ کے عاملِ نظام آباد کے درمیان ۱۷۶۱ء

میں لڑائی ہوئی جس میں دونوں مارے گئے، اور فضل علی خاں حاکم غازی پور نے اُس پر قبضہ کرلیا،

محمد آباد گوہنہ (ضلع اعظم گڈہ) میں حضرت غلام فرید صاحب فاروقی ایک فاضل اجل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، جب فضل علی خاں نے اعظم گڈہ پر قبضہ کیا تو موصوف کو بڑی تمناؤں سے لکھا، کہ آپ تشریف لائیں، اور اس خطہ کی حکومت قبول فرمائیں، انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا،

بیچارہ خر آرزوے دُم کرد — نایافتہ دُم دو گوش گُم کرد

آخر فضل علی خاں تین برس کے بعد غازی پور اور اعظم گڈہ دونوں سے الگ کردیئے گئے،[1]

شجاع الدولہ نے جب ۱۷۶۴ء میں بکسر میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کھائی، تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کرلیا، یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر تھا، "سنگار درپن" اس کی ہندی کی تصنیف ہی، ۱۷۷۱ء میں وفات پائی، اس کے درباری شاعر بہ جو مصرا نے اعظم خاں کی تعریف میں اعظم خانی ستا سائی لکھی، جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۱۷۹ف ۱۷۷۱ء میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۲ بیگھہ زمین انعام میں پائی، اس کے کچھ دنوں کے بعد نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے اس علاقہ کو جہاں یار خاں سے چھین کر نوابی میں شامل کرلیا، اور یہ اودھ کی حکومت کا ایک چکلہ (ضلع) بن گیا،[2] اور نواب کی طرف سے ایک عامل رہنے لگا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں یہاں مرزا عطا بیگ خاں کابلی عامل تھے، لکھنؤ اور جونپور کے بیچ میں اعظم گڈہ کا علاقہ پڑتا تھا، اس لئے اعظم گڈہ کے عامل اس راستہ کی حفاظت کرتے تھے،[3] ۱۸۰۱ء

---

[1] تجلی نور ص ۹۶ تین برس کا تعین گزیٹر میں ہی [2] اعظم گڈہ ڈسٹرکٹ گزیٹر ۱۹۳۵ء ص ۳۹ [3] محمد علی تمنّا خلف خواجہ عبد اللہ تائید عظیم آبادی اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور و ممتاز ادیب و شاعر و مورخ تھے، ریاض المنشآت ان کے خطوط کا مجموعہ ہے، جس میں دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، مرشد آباد وغیرہ کے امراء اور رؤسا، اور دوسرے ممتاز اشخاص کے نام خطوط ہیں، اس مجموعہ میں میرزا عطا بیگ خاں عامل اعظم گڈہ کے نام بھی ایک خط ہی، اس مجموعہ سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہی کہ امین الدولہ نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے اردو اور فارسی کے جو تذکرے صحف ابراہیم وغیرہ لکھے ہیں، وہ درحقیقت اسی مجموعہ کے مؤلف محمد علی تمنّا کی محنت ہی، اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہی اور حبیب گنج میں بھی ہی،

تک یہ چکلہ دار یا عامل اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ کا ایک تاریخی پتھر اس وقت لکھنؤ کے عجائب خانہ میں رکھا ہے، اس میں حکومت کے تمام شہروں کے درمیان کا فاصلہ ریاضی کے قاعدہ سے کھدا ہے، اس میں لکھنؤ اور الٰہ آباد کے بعد تیسرا نام اعظم گڈھ کا ہے،

سنہ ۱۸۰۱ء میں جب یہ علاقہ انگریزی عملداری میں شامل ہوا، تو جہان خاں کے بیٹے نادر خاں کو، جو یہاں کے عاملوں سے برسرپیکار رہتا تھا، ڈیڑھ سو ماہوار کی پنشن اور بارہ ۱۲ گاؤں کی زمینداری دے کر ضلع میں امن و امان قائم کیا، جہان خاں نے سنہ ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا، اُن کی جگہ ان کے بیٹے مبارک خاں نے لی، جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے سنہ ۱۸۵۰ء میں وفات پائی، اور ان کے صاحبزادہ راجہ سلامت خاں مسند نشین ہوئے، راجہ صاحب گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے، مولانا شبلی مرحوم ان ہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اور اکثر اُن کا نام عزت سے لیتے تھے، سنہ ۱۹۱۲ء میں وفات پائی،

اعظم گڈھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات

شاہ گنج سے جو شاہ عالم کے نام سے آباد ہے، اور جو جونپور میں شامل ہے، دو فرلانگ آگے سے اعظم گڈھ کا ضلع شروع ہو جاتا ہے، شاہ گنج سے چند میل دور بہ سمت مشرق سرائے میر آتا ہے، جس نے حضرت میر عاشقاں علیہ الرحمۃ کی نسبت سے سرائے میر کا نام پایا ہے، یہاں ان کا مزار اب تک یادگار ہے، اور اب اسکی شہرت کا ذریعہ وہ مدرسۂ اسلامیہ ہے جس کا نام "مدرسۃ الاصلاح" ہے، جس کو سنہ ۱۹۰۸ء میں یہاں کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا، اور جس سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو تعلق خاص رہا ہے،

سرائے میر سے دس میل بہ جانب مشرق نظام آباد کا قصبہ ہے، یہ بہت سے علماء و اہل اللہ کا مولد و مسکن رہا ہے، سنا ہے کہ دیوان عبد الرشید صاحب "رشیدیہ" کا اصل وطن یہی تھا حضرت میر عاشقاں کے پیر حضرت

شاہ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ عرف شاہ قدن یہیں مدفون ہیں،

سرائے میر سے ۲ میل کے فاصلہ پر ملینھ نگر ایک مقام ہے جو یہاں کی پرانی آبادی ہے، اور جس میں پرانے قلعہ کے آثار اب تک نظر آتے ہیں، دوسری پرانی آبادی ماہل کی ہے جہاں پرانے اشراف سکونت پذیر ہیں، سرائے میر سے متصل پھریہا نام ایک گاؤں ہے جہاں انصار کا ایک گھرانا آباد ہے، یہی گاؤں مولنا شبلی کا نانہال، اور مولنا حمید الدین صاحب کا وطن ہے،

اس کے بعد اعظم گڈہ کا شہر آتا ہے، اس کی مشرقی سمت میں دوسرے مشہور مواضعات اور قصبے ہیں ان میں سب سے پرانا گھوسی کا قصبہ ہے جہاں کے مولنا غلام نقشبند تھے، جو لکھنؤ میں قیام کے باعث لکھنوی مشہور ہوئے اور آج سے چالیس پچاس برس پہلے یہاں مولوی عبدالقادر صاحب نام ایک مشہور عالم اور زمیندار تھے، جن کو امامت کا دعوی تھا، اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے، اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے، اور اسی لئے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے جو اعظم گڈہ میں زمانہ تک مہتمم بندوبست رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آدھا مصرع مولنا شبلی مرحوم کی زبانی مجھے یاد رہ گیا ہے، ع "تعمم تقمص وانتطق اوتسربل" موصوف کے پاس ایک عمدہ کتاب خانہ تھا جو اب بھی ان کے صاحبزادہ کے پاس ہے،

انہی اطراف میں اعظم گڈہ کا دوسرا مشہور قصبہ چریاکوٹ ہے، قدیم آبادی ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے، اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازیپور اور اعظم گڈہ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولنا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحبزادے مولنا عنایت رسول اور مولنا فاروق تھے،

اعظم گڈھ اور چڑیا کوٹ کے بیچ میں مئو ناتھ بھنجن واقع ہے جس کا حوالہ اعظم گڈھ کے راجاؤں کے شاہی فرمان میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا شاہی نام جہان آباد رکھا گیا تھا[1] شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے کے کاریگروں کو جمع کیا، اور ایک جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی کمال صنعت و حرفت کے ساتھ علم و فن کی خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک نیا مدرسہ مفتاح العلوم قائم ہے اور اس کے پرانے حجروں کی جگہ اب نئے حجرے بن رہے ہیں، اس قصبہ میں کثرت سے علماء پیدا ہوئے، اور اب بھی ہیں مولانا عبد اللہ صاحب غازیپوری کا اصل وطن یہی ہے،

مئو اور اعظم گڈھ کے بیچ میں محمد آباد گوہنہ نام مشہور قصبہ ہے حضرت مولانا غلام فرید صاحب جن کا ذکر اوپر گذرا یہیں کے باشندے تھے، انگریزی عہد میں یہاں کے شرفا نے تعلیم پاکر اعلیٰ انگریزی عہدے حاصل کئے، جن میں قابل ذکر ڈپٹی محمد کریم صاحب ہیں جو علی گڈھ میں تقرر کے زمانہ میں سرسید کے رفقا میں تھے اور دوسرا خاندان جسٹس سید عبد الرؤف صاحب کا ہے اسی قصبہ سے متصل ولید پور کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا محمد کامل تھے، جو ۱۲۵۸ھ میں جون پور میں منصف مقرر ہوئے، اور بعد کو بستی وغیرہ اضلاع میں اس خدمت پر مامور ہوئے، ساتھ ہی صوفی کامل بھی تھے، مریدی کا بڑا حلقہ تھا، مولانا فاروق صاحب چڑیا کوٹی کی پہلی شادی ولید پور میں انہی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی

محمد آباد کے قریب مبارکپور نام بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں،

[1] یہ نام اُن فرامین میں ہے جو اس قصبہ کے لوگوں کے قبضہ میں اب تک موجود ہیں،

حسب و نسب و مولد | اعظم گڑہ کی دوسری سمت میں ایک پرگنہ سگڑی ہی، یہ بھی قدیم آبادی ہی آئین اکبری میں اس کا نام ہی، اور اس کو راجپوتوں کا مسکن بتایا ہی، چنانچہ اب بھی اس علاقہ میں راجپوت آباد ہیں، اسی پرگنہ میں بندول کا قصبہ ہی جس کو مولنا شبلی کے مولد بننے کا فخر حاصل ہی، مولنا نے اپنے اس مولد کی تعریف میں تفریحاً یہ شعر کہے ہیں،

فضلِ بندول اگر تو نہ شناسی — آدمی نیستی تو نسناسی
نتواں یافت ہیچ جاے چو او — خرّم و سبز و دلکشاے چو او
ہست از غایتِ فرح بسرشت — مرغزارے مگر ز باغِ بہشت

مولنا کی پیدایش سے پہلے چاہی یہ بیان مبالغہ سے خالی نہ ہو مگر اُن کی پیدایش کے بعد تو یہ یقیناً مبالغہ سے خالی ہی، اسی کے قریب بالکل ملی ہوئی خانقاہ نام قدیم شرفا کی ایک آبادی ہی، یہی وہ مقام ہی جو ڈپٹی محمد خلیل صاحب اور ان کے صاحبزادہ جسٹس اسمٰعیل صاحب جج (ہائی کورٹ الہ آباد) کا اصلی مسکن ہی، اسی کے قریب جیراج پور بھی ایک آبادی ہی جس میں متعدد علما پیدا ہوے، جن میں سے ایک مولنا سلامت اللہ صاحب ہیں،

خانقاہ میں غالباً صوفیاے کرام کا کوئی خاندان آباد تھا جس کے سبب وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوا، یہی وہ جگہ ہی جس کی مسجد کا ذکر مولنا کے قصیدۂ کشمیریہ میں ہی، اور جس کے لئے اپنی جائداد متروکہ کے ایک حصہ کی وصیت اس میں لکھی تھی،

خاصہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است — کہ ز بے مہری ما خستہ و بے برگ و نوا ست

نسب | بندول میں بھی راجپوتوں ہی کی آبادی تھی جس کے مورث اعلیٰ آج سے چار سو برس پیشتر مسلمان

ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولٰنا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی، کیا عجیب بات ہی کہ ایک ہندی نژاد راجپوت آگے بڑھ کر اس قابل ہوا کہ رسولِ مطلبی و ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج و معارف سے دنیا کو آشنا کرے، فاروق اعظم کی سطوت و عظمت کا دلوں میں سکہ بٹھائے، نعمان بن ثابت کوفی امام اعظم کے فقہ و قانون کے مصالح و حِکَم کو نیا جلوہ دے، فصحائے عرب و ایران کی نکتہ سنجیوں کی شناسائی داد دے، اور غزالی و رازی اور مولانائے روم کے اسرار حقیقت کو برملا فاش کرے، ڈاکٹر اقبال نے جو خود بھی ایک ہندی نژاد برہمن تھے، کیا خوب کہا ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ دانائے رمزِ روم و تبریز است

مولٰنا کا خاندانی سلسلہ وہی نومسلم راجپوتوں کا ہی جو راوت کہلاتے ہیں، شجرۂ نسب یہ ہی،

شیوراج سنگھ = سراج الدین

- شہباز
  - شیخ سہراب
    - شیخ احمد چودھری
      - شیخ لعل محمد
        - شیخ مہدی چودھری
          - شیخ محمد اسماعیل
            - شیخ امان اللہ
              - شیخ محمد فخر جہاں
                - شیخ محمد قاسم
                - شیخ محمد تاج
                - شیخ محمد رضا
                  - شیخ کریم الدین
                    - شیخ عباد اللہ
                      - منشی شیخ حسن علی صاحب
                        - شیخ حبیب اللہ
                        - شیخ مجیب اللہ
                          - علامہ شبلی
                            - شیخ محمد حامد
                          - محمد مہدی
                          - شیخ محمد اسحاق
                            - محمد فاروق
                          - محمد جنید
                            - انور
                        - شیخ عجیب اللہ
                          - شیخ علی احمد
                            - جسٹس شیخ اقبال احمد
                            - سلطان احمد
                        - شیخ نجیب اللہ

قبولِ اسلام خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبولِ اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے،

"ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منھ علاقۂ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہوگئی، دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے، گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے، یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں اتار دیں، ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں، اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب و دانہ تھیں، بگڑ کر بولیں، "کیا نرے ترک ہی ہو گئے، جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے، اور سارا کھانا بھرسٹ کر ڈالا"، ایک راجپوت پر ایک عورت کے اس چبھتے ہوئے طعنہ نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علمار کے بحث و مناظرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنا تو کہا مجھے ترک ہونے کا طعنہ دیتی ہو تو میں سچ مچ ترک ہو جاتا ہوں، چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی، بلکہ دینِ حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے، اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا، خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی، اور اب تک یہ لوگ بندول کے قریب دھرسن نامی ایک موضع میں آباد ہیں"۔[1] یہ تو خاندانی روایت ہے، لیکن قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیوراج سنگھ خانقاہ کے کسی بزرگ کی صحبت اور تلقینات سے دل ہی دل میں متاثر ہو رہے تھے، اور آہستہ آہستہ ہندو دھرم کی بندشوں سے آزاد ہوئے جا رہے تھے، اسی سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اسی سے بھاوج کا طعنہ بھی بجا تھا، اور دفعتہً شیوراج سنگھ نے خانقاہ کی مسجد کی راہ بھی اسی لئے لی، یہ واقعہ شاہانِ شرقی کے زمانہ کا ہے،

خاندانی حالات سراج الدین نے قبولِ اسلام کے بعد اپنا حصۂ زمینداری الگ کر لیا، بعد کو اس خاندان

[1] سیرتِ شبلی، از مولوی اقبال احمد خاں سہیل ایم اے ایل ایل بی مندرجۂ الاصلاح نومبر ۱۹۳۶ء ص ۵۱ و ۵۲،

نے مزید رسوخ حاصل کیا یعنی اس کو آس پاس کے مواضعات کی چودھرائی کا منصب مل گیا جو اثر اور اقتدار کے لحاظ سے آجکل کی تحصیلداری سے کچھ اونچا تھا، یہ منصب مدت تک اس خاندان میں قائم رہا،

سراج الدین کے پوتے سہراب نے دنیاوی عزت کے علاوہ مذہبی اعزاز بھی حاصل کیا یعنی اپنی باطنی کیفیت میں یہ ترقی کی کہ اُن کے مرشد نے ان کو بیعت کی اجازت دی، اور شیخ کے معزز لقب سے سرفراز کیا، اسی لئے نو مسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف یہ لوگ خان کے بجائے شیخ کہلاتے ہیں،

ناناہال انصاری شاید اسی لئے نو مسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف ان لوگوں نے شادی بیاہ میں صرف اپنے ہی خاندان تک محدود رہنے کی پابندی نہیں کی، بلکہ دوسرے مسلمان شرفا کے خاندان میں بھی شادیاں کیں، چنانچہ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی، جو پھریہا میں آباد ہی، شیخ صاحب کے خسر اور مولانا کے نانا کا نام حاجی قربان قنبر انصاری تھا،

بزرگوں کے حالات مولانا کے جد اعلیٰ شیخ کریم الدین صاحب گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانہ میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے، اور اپنی ذاتی آمدنی سے بڑھا و احسام الدین پور نام ایک علاقہ خریدا جس میں دس بارہ گاؤں تھے، یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہی،

مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڈھ میں مختار تھے، اور مولانا کے نانا شیخ قربان قنبر انصاری انگریزی تسلط کے ابتدائی زمانہ میں اعظم گڈہ کے ایک مشہور وکیل تھے، مولانا سے سنا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار بھی سناتے تھے جو شاید اہلبیت رضی اللہ عنہم کی منقبت میں تھے، مولانا حمید الدین مرحوم مصنف نظام القرآن ان ہی شیخ قربان قنبر انصاری کے پوتے ہیں،

شیخ حبیب اللہ | مولنٰنا کے دادا نے چار اولادیں چھوڑیں، حبیب اللہ[۱]، مجیب اللہ[۲]، عجیب اللہ[۳]، نجیب اللہ[۴]
مولنٰنا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے، انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا، چنانچہ مولنٰنا نے شعر العجم میں اُن کے اس حسنِ ذوق کی ایک مثال لکھی ہے، فرماتے ہیں ؛

"میرا طالبعلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا،

سر بہ بُستان چو دہد جلوهٔ یغمائی را ۔۔۔ اول از سرو کَنَد جامهٔ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا، کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لئے شاعر اگر "کَنَد" کے بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والدِ مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ "نہیں یہی لفظ (کَنَد) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے، کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا ہے، تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اتارے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروائے جائیں یا نچوائے جائیں، فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کَندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی"[لہ]

اس زمانہ میں فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چونکہ شیخ صاحب کے گھر میں زمینداری اور مقدمات وقانونِ عدالت کا چرچا تھا، اس لئے الٰہ آباد ہائیکورٹ کی وکالت حاصل کی، اور اس پیشہ میں اُن کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے،

اُن کی جوانی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا دوسرے شہروں کی طرح اعظم گڈھ میں بھی شورش

لہ شعر العجم جلد چہارم صہ ۱۸۱، ۱۲

پیدا ہوئی، جیل خانہ کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا، اس زمانہ میں یہاں وینیلس صاحب کلکٹر تھے، اُن کے ساتھ مل کر شیخ صاحب نے اپنے پرگنہ سگڑی میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں گاؤکشی کا جو مشہور ہنگامہ اعظم گڈھ میں ہوا، اس میں بھی امن وامان قائم کرنے میں گورنمنٹ کو مدد دی، اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا، جس سے شہر خطرہ میں تھا، اس وقت حکام کے ساتھ ملکر شہر اور دریا کے بیچ میں ایک بند بندھوانے میں بڑی مدد دی،

اسی طرح شہر اور ضلع کے پبلک کاموں میں وہ ہمیشہ شریک اعظم رہے، اُس زمانہ میں میونسپلٹی کے صدر (چیرمین) ضلع کے حکام ہوتے تھے، اور اُن کی ماتحتی میں شہر کے معززین آنریری سکریٹری ہوکر عملاً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، شیخ صاحب جب تک ان کی صحت کام دیتی رہی اس خدمت کو اعزازی طور سے انجام دیتے رہے، فیضِ فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں محترم تھے، اُس زمانہ کی سیاست میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی، اس لئے وہ ہندو مسلمان ہر ایک کے کام آتے تھے اور ہر ایک اُنکی عزت کرتا تھا

اس زمانہ میں نیل کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، شرقی اضلاع میں کثرت سے نیل کی کاشت ہوتی تھی اور چمپارن وگورکھپور سے لے کر اعظم گڈھ تک نیل کی کھیتی کھڑی اور نیل کی کوٹھیاں جاری تھیں، شیخ حبیب اللہ صاحب کی بھی نیل کی کوٹھیاں تھیں، جن سے سال میں خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم کے مکاتیب میں کہیں کہیں اس کا ذکر ہے[1]، اس زمانہ میں زمیندار دیسی شکر بھی بناتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، شیخ صاحب نے بھی دیسی شکر کے کارخانے قائم کئے تھے، بزرگوں کے موروثی

---

[1] مکاتیب شبلی اوّل ص۱۳ و دوم نامہ فارسی نمبر ۱۲،

علاقہ میں اپنی ذاتی آمدنی سے خرید کر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، چنانچہ گھاگھرہ کے کنارے دیوارہ کا علاقہ جو اس خاندان کی ملکیت میں ہے اُن ہی کا حاصل کیا ہوا ہی، وکالت و زمینداری اور نیل اور شکر کی تجارت سے اونکی تقریباً تیس ہزار سال کی آمدنی تھی، اور سرکار کو چھ ہزار سال کی مالگذاری دیتے تھے،

غرض علمی قابلیت، قانونی لیاقت، اخلاقی شرافت، دنیاوی وجاہت، ہر دلعزیزی، دولت و ثروت اور سعادتمند اولاد ہر طرح کی نعمت شیخ صاحب کے حصہ میں آئی تھی، مذہبی مذاق بھی رکھتے تھے چنانچہ مولوی محمد کامل صاحب ولید پور کے مرید خلیفہ الٰہی شاہ صاحب[1] (ساکن سہرہ ضلع جونپور) کے مرید تھے

شیخ صاحب کے دوسرے بھائیوں نے فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مکاتیب میں مولانا کا ایک فارسی خط اُن کے ایک چچا کے نام جو غالباً شیخ عجیب اللہ ہیں موجود[2] ہی جس میں پوری انشاپردازی صرف کی گئی ہی، شیخ عجیب اللہ صاحب کے نام ایک اردو خط بھی مکاتیب[3] میں ہی، اس میں بھی شاعرانہ تکلفات ہیں، اور ان کو علی گڈھ آنے کی دعوت اور بعض علمی اطلاعات درج ہین، انہی شیخ عجیب اللہ صاحب کے پوتے جسٹس محمد اقبال ہائیکورٹ الہ آباد کے جج ہیں،

شیخ حبیب اللہ صاحب کو اپنے بھائیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی، چنانچہ انہوں نے جو جائدادیں حاصل کیں وہ صرف اپنے نام نہیں رکھیں، بلکہ برابر برابر سب بھائیوں کو بانٹ دیں،

والدہ ماجدہ مولانا کی والدہ جو حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحبزادی تھیں، نہایت نیک اور دیندار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں، مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر

---

[1] مکاتیب دوم نامۂ فارسی ۱۲ میں ان کا ذکر ہی [2] مکاتیب دوم نامہاے فارسی (۳) [3] مکاتیب اول،

فرمایا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ ان کو سحر خیزی کی عادت ان ہی کے حسنِ تربیت سے پڑی، شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو شادی کر لی تھی اس سے وہ بہت دلگیر رہا کرتی تھیں، اور آخر اسی غم میں ۱۸۸۶ء سے پہلے ہی وفات پائی[1]، مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں دو چار شعر اور لکھے جن کو بعد میں کاٹ دیا تھا ان میں ایک بند کا مصرع یہ تھا، ع

ماتمِ مادرِ دلگیر بھی دیکھا میں نے

اور اُن کی یادگار میں اپنے نیشنل اسکول میں جو آجکل "شبلی جارج ہائی اسکول" اعظم گڈھ ہی ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں "صدر المنازل" کے نام سے ایک ہال بنوایا ہے[2]،

اولاد | شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے انکی ان بیوی سے چار بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی، بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد شیخ صاحب کے سامنے ہی مر چکی تھی، بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے، ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے، ان کی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور خردانہ اطاعت و پاسِ ادب کا اعتراف

---

[1] مولانا نے ۲۶ جنوری ۱۹۰۶ء کو اپنے ایک عزیز کو جن کی والدہ کا ابھی انتقال ہوا تھا ایک تعزیت کا خط لکھا ہے جس میں اپنی ماں کی وفات کے سانحہ پر اپنے احساسِ غم کا تذکرہ کیا ہے [2] اس ہال پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

هو الله

این ایوانِ دلکشا کہ صدر المنازلِ این مدرسہ ہست

از زرِ عطیۂ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

المخاطب بہ

شمس العلماء

سکرٹری این مدرسہ و فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد

بہ یادگار

والدۂ مرحومۂ ایشاں تغمدہ اللہ بغفرانہ

بماہ دسمبر ۱۸۹۸ء شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت

مولنٰنا کو ہمیشہ رہا، اور مولنٰنا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی، چنانچہ جب اپریل ۱۸۸۵ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولنٰنا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی، جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرعہ پر تھا ع "بہ سلامت روی و باز آئی"۔ اس نظم کے صرف دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے۔

خار در دیدۂ عدو شکنی — حاسداں را جگر گداز آئی

ما بہ نادیدہ در رہت باشیم — کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی، اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی، اس نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا، اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے اُمنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی، اس لئے ۸۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو اُن کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے اُن کا استقبال کیا گیا تھا، اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا، کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کی گئی، جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا، افسوس کہ یہ ہنگامۂ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہو سکیں، ولایت ہی میں اُنکی صحت خراب ہو چلی تھی، جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی، مجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ۱۸۹۲ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۷ء میں اعزہ کو داغِ مفارقت دے گئے، مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادی تھیں، جو مولنٰنا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں،

لہ تاریخ وفات ۲۹ جون ۱۸۹۶ء ہے، دیکھئے (ہمیع ۱۸)

مولنا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے، اور قابلیتِ قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعتِ خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے، مگر انھوں نے بھی جوانی ہی میں اگست ۱۹۱۴ء میں وفات پائی، مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہٗ اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں، بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولنا حمید الدین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محمد عباد سے بیاہی تھیں، چھوٹی نے چند سال ہوئے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۳۹ء میں وفات پائی،

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لئے ناقابلِ برداشت تھا جس کا شاہدِ حال ان کے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے، اور آخر یہ کانٹا اُن کی جان لیکر نکلا،

مولنا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولنا کے صاحبزادے حاجی محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے، کچھ دنوں اعظم گڈہ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے، اور تقریباً پچپن برس کی عمر میں جبکہ وہ بہ مقام کانپور سب جج تھے دہلی میں جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے ۱۹۳۳ء میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے، یہی وہ جنید ہیں جن کی نسبت مولنا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں یہ لکھا تھا،

"خوش وخرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید"

مولنا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی، جن سے ایک صاحبزادے محمد مرحوم تھے، یہ بھی اپنی بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے، اور گریجویٹ ہو چکے تھے، مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی اسی دن چند گھنٹے پہلے دو دن کی علالت

ہیں وفات پا چکے تھے، مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا، ایسے سعادتمند اور کامیاب بیٹے کی مرگِ ناگہاں وہ بھی عین عنفوانِ شباب میں انتہائی جانکاہ حادثہ تھا، مرحوم نے ایک بچہ "مظفر حسین" اپنی یادگار چھوڑا، اس حادثہ کے بعد سے قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی نازبرداریاں کرتے، چنانچہ مولنا مرحوم نے اپنے پدرِ بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے،

ہاں آں قدر بماں کہ مظفر جواں شود ... مپسند اینکہ بیکس و بے خانماں شود

ولادت | مولنا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اُس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے "غدر" کے نام سے مشہور ہے، اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڈہ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے،

نام | والدین نے بچہ کا محمد شبلی نام رکھا، عجب نہیں کہ یہ نام شیخ صاحب نے اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا ہو چھوٹے کا نام جنید رکھا تھا، وہ بھی اسی ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی المتوفی ۳۳۴ھ کا نام مشہور ہے، مگر درحقیقت یہ نام نہیں، اُن کا نام ابوبکر دلف بن مجدر بتایا جاتا ہے، اور شبلی اُنکے وطن شبلیہ (واقع اشروسنہ ترکستان) کی طرف منسوب ہے[1]، یہ نسبت اُن پر ایسی غالب آئی کہ اُس نے نام کی جگہ لے لی،

ابتدائی تحریروں میں مولنا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کیساتھ نعمانی لکھنے لگے،

لطیفہ:- مولنا شروانی صاحب فرماتے ہیں میری بڑی پھوپھا عنایت اللہ خانصاحب رئیس بھیکن پور سر سید کے ابتدائی ہمدرد مخلصوں میں تھے، اُنکی عنایت کی یادگاریں اب بھی یونیورسٹی میں قائم ہیں، علامہ شبلی کے تقرر کے

[1] انساب سمعانی،

ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی و جنید نام سے تو کہا گیا یہ بغداد سے آئے ہیں،

"نعمانی" کی اس نسبت سے بعض لوگون کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں، یا وہ اپنے کو اُن کے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں، واقعہ یہ ہی کہ مولنا ابتدا میں نہایت سخت حنفی تھے، اور حنفی کہلانا اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے، اور طبیعت جدت پسند تھی اس لئے حنفی کے بجاے اپنے آپ کو نعمانی کہا، بلکہ یہ نسبت انھون نے خود سے اختیار نہیں کی، اُن کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی نے اُن کا لقب نعمانی رکھدیا تھا، مولنا فاروق مرحوم بھی سخت غالی حنفی تھے، اور ان دنوں مولنا عبد اللہ صاحب دمئوی ثم غازیپوری) کے سبب سے جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے، مقلد و غیر مقلد کی صدائیں ان اطراف میں بلند تھیں اور (حنا ف و اہل حدیث میں معرکے برپا تھے، اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی، اسی ماحول میں استاد نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا جو بعد کو شاگرد کے نام کا جزء بن گیا،

مولنا نے ابتداے جوانی میں اردو میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا، فارسی میں شبلی اکثر اور ایک آدھ غزل میں نعمانی بھی رکھا ہی،

بہ خواری کہ ز کوے تو رفت نعمانی — گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید

دو غزلون میں پورا نام ہی تخلص میں ڈال دیا ہے،

اے شبلی نعمانی ایں پردہ دری از چیست — اینہا کہ ز خود گفتی من نیز خبر دارم

ہم ز فیض شبلی نعمانی است — ایں کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی صرف وزن کے سبب سے ہی، اسکا مطلب یہ نہیں کہ نعمانی ان کا تخلص تھا

بچپن | مولنا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گذرا، فطرۃً ذہین تھے، اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت ہی بچپنے کی بعض باتیں سناتے تھے، ایک دفعہ کا اسی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے، کہ چاندنی رات تھی، صحن میں لیٹے تھے، اور لوگ اٹھا کر ان کو سائبان میں لے جانا چاہتے تھے، اور یہ نہیں جاتے تھے، کسی نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا، فوراً جواب دیا واہ چاند تو نکلا ہی، پانی کیسے برسے گا، لوگ اس پر ہنس پڑے مگر اس ذہانت کے ساتھ ان کی اس طفلانہ سادگی کا قصہ بھی سنئے، ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ مقرر تھا، ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا، شیخ صاحب کا ایک پرانا ملازم ان کی دیکھ بھال کرتا تھا وہی پیسہ دیا کرتا تھا، مولنا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ لیتے اور ضد کرتے تو وہ پیسہ کو آگ پر رکھ دیتا اور کہتا کہ ابھی پیسہ بن رہا ہے، اور آخر وہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا،

تعلیم و تربیت | مولنا کی والدہ مذہبی تھیں، اور خود شیخ صاحب بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا سے ناآشنا تھے، اس لئے اپنی پہلی اولاد کو خدا کا نام لے کر علم دین کی خدمت کے لئے وقف کیا، بعد میں سر سید مرحوم کی (جو بنارس اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک حاکمِ عدالت رہے) تقریر و تحریر کے اثر سے بہت کچھ متاثر ہو گئے تھے، اسی لئے اپنے دوسرے بچوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوائی

شیخ صاحب مرحوم نے قدیم رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بیٹے کا مکتب کیا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، اُن کے گاؤں کے قریب جیراجپور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء تھے، جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، وہی پہلے معلم مقرر ہوئے، چنانچہ مولنا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی، اور کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب المتوفی ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء سے جو سبرہد

ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے، پڑھا،

فطری آثار کمال | مولوی عبد اللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثار کمال پائے جاتے تھے، ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں، حالانکہ اُن کا یہ بچپن تھا، مولوی محمد عمر صاحب بزرگان قدیم کی ایک عمدہ یادگار تھے، وہ مولٰنا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے، وہ بہ سبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولٰنا میں ادبی مذاق بھی بچپن ہی سے تھا، اس زمانہ میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لئے بیتاب ہو جاتے، اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا،

وہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے تھے، کتابیں اُلٹتے پلٹتے اور شعراء کے دیوان پڑھتے اور مناسبت طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے[1]،

مدرسہ عربیہ اعظم گڈھ | شیخ صاحب مرحوم اور شہر کے دوسرے اہل استطاعت اصحاب نے مل کر اعظم گڈھ ہی میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں پہلے تھوڑے عرصہ تک مولٰنا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ[2] صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، مولٰنا نے اسی مدرسہ

۱؎ مضمون مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کلیم بی اے وکیل اعظم گڈھ، معارف جلد سوم ۱۹۱۸ء ص ۵۲ ۔ یہ مئوناتھ بھنجن (ضلع اعظم گڈھ) کے باشندے تھے، آخر میں مطب کرنے لگے تھے، اور اسی تعلق سے دانا پور پٹنہ میں رہتے تھے، وہیں ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں وفات پائی، ان ہی کے صاحبزادہ مولوی ابوالمکارم محمد علی مئوی تھے، جو مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد

میں مولوی صاحب موصوف سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں،

مولنا علی عباس صاحب چریاکوٹی سے تلمذ

تذکرہ علمائے حال[1] میں جو ۱۸۹۷ء میں مولنا کے علم اور مشورہ سے لکھا گیا، مولانا کے استادوں میں ایک نام مولانا علی عباس صاحب چریاکوٹی کا لکھا ہے،

مولوی علی عباس صاحب چریاکوٹی بن شیخ امام علی ماں کی طرف سے ملا باب اللہ جونپوری کی اولاد سے تھے، بڑے منطقی، مناظرہ پسند اور عربی کے شاعر و ادیب تھے، ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی،[2]

مولنا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پور

مولوی عبد الحلیم صاحب شرر نے جو مولنا کی جوانی کے دوست تھے، مولانا کے حال میں لکھا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حنفیہ امام بخش جون پور میں غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری سے جو سلسلۂ خیرآباد کے نامور مدرس تھے، چند روز پڑھا تھا، مولنا کے مکاتیب فارسی میں بھی اس مدرسہ کے چند حوالے آئے ہیں، جن سے اس مدرسہ سے اُن کے تعلق کا پتہ چلتا ہے،

لیکن درحقیقت مولنا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مولنا فاروق صاحب چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں،

مولنا فاروق صاحب

مولنا محمد فاروق[3] صاحب چریاکوٹی ان دنوں چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس تھے

---

[1] مؤلفہ مولنا محمد ادریس صاحب نگرامی مطبوعۂ نول کشور لکھنؤ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۲ [3] مولنا محمد فاروق عباسی اور مولنا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی اس زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، یہ دونوں قاضی علی اکبر ابن قاضی عطار رسول چریاکوٹی کے صاحبزادے تھے، اور معقول و منقول و ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالامال تھے، مولنا عنایت رسول صاحب ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے تھے، علوم معقول و ریاضی و حساب و ہیئات مولوی احمد علی چریاکوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول صاحب بدایونی المتوفی ۱۲۸۹ھ سے جو دو واسطوں سے ملا بحر العلوم کے شاگرد تھے حاصل کیا، اور حدیث مولنا حیدر علی رامپوری شاگرد شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جاکر پڑھی، واپس آکر عبرانی پڑھنے کا شوق ہوا، تو اس زمانہ میں کلکتہ جاکر یہودیوں سے عبرانی پڑھی، اور توراۃ و انجیل و زبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا، آخر وطن آکر قیام کیا ۔ ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، سید احمد خاں مرحوم بنارس و غازیپور کے قیام کے زمانہ میں ان کے علم و فضل سے واقف ہوئے، اور توراۃ و انجیل و زبور کے مباحث کے حل کرنے میں ان سے

ان کی تعلیم و تدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا، اور شیخ صاحب سے خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان کے پیر الٰہی شاہ صاحب (ساکن سبرہد ضلع اعظم گڈھ) کے پیر مولانا کامل صاحب ولیدپوری کے داماد تھے، اس لئے شیخ صاحب نے مولانا کو ان ہی کے پاس غازیپور بھیجدیا، غازیپور میں گنگا کے کنارے قدیم شرفا کا ایک محلہ ہے، جس کو میانپورہ کہتے ہیں، یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان آباد ہے، جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اس خاندان کے مشہور افراد ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲) پوری مدد دی، اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، سر سید کے مطبوعہ خطوط میں انکے نام بھی چند خط موجود ہیں،

مولنا محمد فاروق صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولنا عنایت رسول سے پڑھا، علاوہ ازیں ہیئات کا فن مولنا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی (بانی چشمۂ رحمت غازی پور) سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے، اور حاشیہ زاہدیہ بر شرح ملا جلال مولوی ابوالحسن صاحب منطقی سے اور بعض علوم ملا نعمت اللہ فرنگی محلی سے پڑھے، علوم معقول و منقول و ریاضی و ادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی، ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علٰحدہ ہوکر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اسکا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے تو چشمۂ رحمت غازیپور میں مدرس ہوے، پھر اعظم گڈھ کے مدرسہ میں آئے، کانپور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسۂ خانقاہ میں جو اب بھی قائم ہے کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۷ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دار العلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، خاکسار کو وہیں آپ سے استفادہ کا موقع ملا، اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں جب مولنا شبلی نعمانی مرحوم دار العلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوے، موصوف نے ترک ملازمت کرکے بلیا میں وکالت شروع کی، اور بعض شائق انگریز حکام کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۹۰۹ء میں مولنا شبلی مرحوم نے پھر ان کو دار العلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا، چند روز رہ کر غازیپور گئے تھے، کہ اسباب و سامان یہاں سے آئیں کہ وہیں ۲۰- اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی،

مولنا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم و نثر میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا، اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنائع و بدائع کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقوط قصائد اور خطبے، مولنا کی تصنیفات میں سے عربی و فارسی نظم و نثر کے بعض رسائل یادگار ہیں، مثلاً منظومۂ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف القناع عن وجوہ الامتناع اور تطلیقات ثلثہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے، اردو شاعری بھی کرتے تھے، چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڈھ کے ۱۸۹۳ء کے ہنگامۂ گاؤکشی کا واقعہ نظم کیا ہے، اور دوسرا مسدس عوالی ہے، جو مسدس حالی کے جواب میں ہے، جسمانی یادگار محل اولیٰ یعنی مولانا کامل صاحب ولیدپوری کی صاحبزادی سے دو صاحبزادے ہیں، شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب اور مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریا کوٹی،

دوسری شادی غازیپور میں کی تھی جس سے کئی صاحبزادے ہوئے، مگر ان میں سے عربی تعلیم صرف ایک نے پائی یعنی ح

مورث اول شاہ جنید کی بنوائی ہوئی مسجد کا لب دریا نہایت دلکش منظر ہے، اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے، مولٰنا شبلی مرحوم غازیپور میں اسی مکان کی کوٹھری میں رہتے تھے، خاکسار جب غازیپور گیا تھا تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی،

استاد کی نسبت شاگرد کا بیان

اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں مولٰنا شبلی مرحوم نے اپنے استاد کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ معتبر بیان ان کے متعلق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لکھتے ہیں:-

"مولانائے موصوف چریا کوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، انھوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولٰنا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بہ طور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے،

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لئے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے، نہ اس کی ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سی سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے، اور وہ بھی ناتمام رہ گئے، تمام مسائلِ علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے، اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے،

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں، اور میری تمامتر کائنات ان ہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے، اکثر

اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے،

چونکہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی، اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں کہ مشتے نمونہ از خروارے

رسیدی در بودی دین و دل ز جنبش چشمے — بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی

بگلشن آمدی غنچہ را در خوں جگر کردی — نسیم آسا سمندِ ناز برگل تاختی رفتی

ــــــــ :: ــــــــ

نہ دارد دل دگر تابِ طپیدن — نگاہِ خویش را رحم آشنا کن

نہ دارد چشمِ من تابِ جمالت — بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن

ــــــــ :: ــــــــ

زمانہ گر ز خطِ حکم تو بہ پیچد سر — دو رشتہ شب و روزش بہ تن شود زنار

مولنا فاروق مرحوم منطق کی تعلیم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی دیتے تھے، یعنی نسب اربع قضایا اور اشکال سب کی باقاعدہ مشق کراتے تھے، اور اس کے لئے شرح مطالع کا درس خاص طور سے دیتے تھے، چنانچہ مولنا شبلی مرحوم کو بھی ان کی مشق کرائی تھی، اور اس کا درس دیا تھا، (دار العلوم میں مولنا فاروق صاحب نے ہماری جماعت کو بھی تہذیب اسی اصول سے پڑھائی تھی) اسی کا نتیجہ تھا کہ مولنا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں میں مشاق ہو گئے تھے، اور منطق اور فن مناظرہ کے اصول سے اُن کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا،

استاد و شاگرد میں اتحاد مذاق کی متعدد جہتیں جمع ہو گئی تھیں، اسی اتحاد مذاق نے استاد و شاگرد کے معنوی ربط کو اور زیادہ قوی کر دیا، اور بالآخر جس طرح استاد کی کشش شاگرد کو غازی پور کھینچ کر لے گئی تھی، اب شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڈہ کھینچ لائی، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰ھ کے پس و پیش کا ہے، اسی مدرسہ میں جو شیخ صاحب نے قائم کیا تھا مولنا فاروق صاحب مدرس اول ہوئے، باہر سے بھی کچھ طلبہ کھینچ کر آئے،

جس میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم ہے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو ڈاکٹر انصاری کے مختصر نام سے معروف تھے اور جو یوسف پور ضلع غازیپور کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب جو حکیم نابینا کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، اسی زمانہ میں مولنٰنا شبلی مرحوم کے ساتھ اسی مدرسہ میں مولنٰنا فاروق صاحب سے پڑھتے تھے، شاید ۱۹۲۳ء میں حکیم صاحب سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی تھی تو[1] اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے، اور اس مدرسہ کا حال پوچھتے تھے،

مولنٰنا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولنٰنا فاروق کا سا متبحر استاد فیضِ تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں، اور ہونہار شاگرد استاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا، چنانچہ مولنٰنا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے تھے، "اَنَا اَسَدٌ وَاَنْتَ شِبْلِی" (میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر) اس میں شبلی کی تلمیح قابلِ توجہ ہے،

فلسفہ کی تعلیم پر استاد نے پوری ہمت صرف کی تھی، اور شاگرد نے بھی پوری محنت سے حاصل کی تھی، ایک خط میں خود لکھتے ہیں:- "میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا، اور مدتوں اس میں منہمک رہا" (شروانی ۱۲) اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے علم کلام کی مہارت اور دلچسپی میں اس فن کی مہارت نے خاص طور سے مدد دی،

مولنٰنا کو سالہا سال کے بعد بھی جب فلسفہ کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا، فلسفیانہ مباحث پر اتنا عبور حاصل تھا، کہ ۱۹۰۵ء میں ہمارے درجہ میں شمس بازغہ کا سبق شروع ہوا اور اس اہتمام سے شروع ہوا کہ ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب پوری تیاری سے اس کو پڑھاتے تھے، اور مولنٰنا درجہ میں آکر اس پر اعتراض وارد فرماتے تھے اور دونوں میں دیر تک رد و قدح جاری رہتی تھی اور ہم لوگ محو تماشا رہتے تھے

---

[1] افسوس کہ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں دلی میں وفات پائی،

ہمارے عزیز دوست مولانا سید مناظر صاحب گیلانی اُن دنوں ٹونک میں سلسلۂ خیرآباد کے مشہور مدرّس مولانا حکیم ابوالبرکات صاحب سے فلسفہ پڑھتے تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے تو راستہ میں لکھنؤ میں ہم لوگوں کے پاس ٹھہر جاتے، مولانا کا قیام اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھا، مولوی مناظر صاحب ان کے پاس ایک دو دفعہ ملنے گئے تو سلسلۂ خیرآباد کے تعلق سے ان سے بعض فلسفیانہ مسائل امتحاناً پوچھے اور اس کے بعد ان پر ایسی اچھی بحث فرمائی کہ مولوی مناظر صاحب اب تک اسکی مدح فرماتے ہیں،

مدرسۂ اسلامیہ اعظم گڈھ کی ویرانی کا منظر

مولانا نے قریب قریب درجۂ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے تعلیم پائی، یہ مدرسہ اعظم گڈھ کی موجودہ آبادی سے دکھن طرف پرانی تحصیل کی عمارت سے متصل واقع تھا، اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہی ہی، اور یہ سارا حصہ کھیت ہوگیا ہے، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ "مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڈہ آتے تو اکثر اس بقعہ پر تشریف لے جاتے، اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر ہوتی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، زبانِ قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے، ایک مرتبہ وہ بھی ساتھ تھے، شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ، سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے، بہار کا ولولہ انگیز موسم، شام کا سہانا وقت، کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول، ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لئے باغ باغ ہو جاتا، مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعتہً ایک کھیت کی مینڈ پر رُک گئے، آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو گئے، اور اپنے دلگداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے،

جائیکہ بود آں دِلستاں در بوستاں با دوستاں — شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن

از فرّ یار خرگہی ایواں ہمی بسینم تہی — وز قد آں سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

برجائے رطل و جام مَی گوراں نہادستند پے — برجای چنگ و نائے و نے آواز زاغ ست و زغن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا "میری نگاہوں میں وہ سماں پھر رہا ہے جب اسی مقام پر مولٰنا فاروق مرحوم شرح مطالع کا درس دیا کرتے تھے، یا آج یہ عالم ہے کہ در و دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہی،

تفانبك من ذكرى حبيب ومنزل

رامپور اور لاہور کے تعلیمی سفر سنہ ۱۲۹۱ھ و سنہ ۱۲۹۲ھ

علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولٰنا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن اُن کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا، مولٰنا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے، علاوہ بریں وہ بلا ضرورتِ شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، مگر مولٰنا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں مولٰنا کی بیتابیٔ شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا، اُن ہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولٰنا نے طلبِ علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں کو خیر باد کہا،

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علما، اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں تھیں، لکھنؤ میں مولٰنا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بہارِ علم تازہ تھی، سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث، اور دیوبند میں مولٰنا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولٰنا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا، رامپور میں خلد آشیاں نواب کلب علیخاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے اربابِ کمال یکجا کر دیئے تھے، راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے،

کہ اول اول ان کو مولنا عبدالحیٰ فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامۂ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے، اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لئے زانوے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے، اور رامپور کا رخ کیا، یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتاے روزگار تھے معقولات میں سلسلۂ خیرآبادی کے خاتم مولنا عبدالحق خیرآبادی اور فقہ میں مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی، ابتداءً مولنا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں مگر ان بزرگواروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا،

مولنا ارشاد حسین رامپوری معقولات میں مولنا فاروقی کے فیض سے خود علامۂ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لئے صرف مولانا ارشاد حسین[1] کے شرف تلمذ پر اکتفا کی، علامۂ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا، اور اکثر بسبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے، مولنا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی اثبات الحق کے جواب میں انتصار الحق ان ہی نے لکھی ہے، اور علامۂ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا، غالبًا یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو، بہرحال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب

[1] مولنا ارشاد حسین صاحب حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے، کتب معقول لکھنؤ میں پڑھی تھیں، اور باقی علوم ملا نواب صاحب افغانی سے جو اس عہد کے بڑے باکمال عالم تھے حاصل کئے تھے، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی کے مرید تھے، ظاہر و باطن دونوں آراستہ تھا، نواب کلب علی خاں مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ۸ رجادی الاُخری ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی، تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرۂ کاملان رامپور حافظ احمد علی خاں شوق ص ۳۰ ،

کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ واصول کی تعلیم حاصل کی، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی،

دیوبند کی حاضری اس زمانہ میں دیوبند کے مدرسہ میں مولنا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوے پڑھتے تھے، اس کشش سے وہ دیوبند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم نہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ نہیں پڑھا، مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں جن پر مولنا نے اپنا نام لکھا تھا، وہ کتابیں وہاں اب تک ہیں، اور ان پر اُن کا نام لکھا اب تک موجود ہے،

مولنا فیض الحسن لاہور اس زمانہ میں مولنا فیض الحسن[1] سہارنپوری پروفیسر اورنیٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو، طلب کی تشنگی نے اس چشمۂ فیض سے بھی شادکام ہونا چاہا، اور سفرِ پنجاب کے لئے کمربستہ ہوگئے، اوّلاً مولنا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ختم ہوچکی، اب وکالت کے امتحان کی تیاری کریں، مگر آخر کار مولانا کے عزم واستقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی، اور صرف پچیس روپیہ زادِ راہ لیکر لاہور چل کھڑے ہوئے، اُن دنوں

[1] مولنا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سلسلۂ خیرآباد کے حلقۂ زریں مولنا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے مولنا خیرآبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاد تھے، عربی قصائد اُن کے یادگار ہیں، موصوف نے ۱۲۷۸ھ میں قید فرنگ میں جزیرۂ انڈمان میں وفات پائی، مولنا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب پیدا کردیا اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو قدیم شعرائے ادب کی طرف متوجہ کیا، حماسہ کا درس ان ہی نے رائج کیا، اور حماسہ کی شرح فیضی کے نام سے ۱۲۹۴ھ میں لکھی، ان کا عربی دیوان اُنکے شاگرد مولنا حمید الدین صاحب نے ۱۳۲۴ھ میں حیدرآباد میں چھپوادیا ہے، اور خود مولنا فضل حق صاحب نے یہ فیض حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی سے حاصل کیا تھا، حضرت شاہ صاحب عربی کے ایسے ادیب وشاعر تھے کہ خود عربی کے اہل زبان اُنکا لوہا مانتے تھے،

اعظم گڈھ تک ریل نہ تھی، اعظم گڈہ سے جون پور تک تین روپیہ کا یکہ کرایہ کیا، اس پر آئے، جون پور سے سہارنپور تک سات روپے کا اور سہارنپور سے لاہور تک پانچ روپئے کا ٹکٹ لیا، طبیعت چونکہ ہمیشہ سے خود دار اور غیور تھی، اس لئے عربی کے عام طالب علموں کی طرح خانۂ خدا میں ناخواندہ مہمان بن کر جاگیر کی روٹیوں سے شکم سیری گوارا نہ کر سکے، ایک روپیہ مہینہ کے کرایہ کا ایک چھوٹا سا مکان یا کمرہ لیا، اور آٹھ دس روپئے میں دو مہینے کسی نانبائی کی دکان سے کھانے کا بندوبست کیا، اور اتنے زمانہ تک تنگدستی کی تکلیف کو ہنسی خوشی جھیل لیا، مگر والد بزرگوار کو اس لئے زحمت نہ دی کہ وہ اس سفر پر راضی نہ تھے یہ پوری داستان خود مولانا کی زبان سے سنیئے، دو مہینوں کے بعد جب ہاتھ بالکل خالی ہو گیا تو مجبوراً اپنے والد ماجد کو لکھا، "مرا دو ماہ می گذرد کہ ترکِ وطن کردہ ام و بہ بے گانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بہ کرایۂ یکہ از اعظم گڈہ تا جون پور رفت، ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارنپور شدہ بود و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی می ماند، اوّل کہ دریں جا رسیدیم دو یک روپیہ بہ حوائجِ ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد،

مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند بہ صرف طعام آمد، اگر انصاف رود بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش ازو متصور نیست، چوں مزاج عالی اندکے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم اکنوں کارم مشکل افتادہ است، دیگر چہ گویم۔" (مکاتیب نامۂ فارسی۔ ۱)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبِ علم کی راہ میں دلدادگانِ کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے، جس سے اندازہ ہو گا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا، موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا

تصور بھی نہیں کر سکتے،

مولٰنا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے، اس لئے زیادہ وقت وہیں صرف ہوجاتا بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا، کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کر رہے تھے، جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے، اس ماحول میں اگر کوئی اور استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولٰنا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو انہی وقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا، مگر ایک طرف تو مولٰنا شبلی کا عزم راسخ بے نیلِ مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولٰنا فیض الحسن کا ذوقِ افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسی میں مولٰنا ادبیات کا درس لیا کریں، یعنی آنے جانے میں معلّم یا متعلّم کا جو قدم بھی اٹھے وہ بھی افادہ و استفادہ علم سے خالی نہ ہو،

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم من آں روزی کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانہ میں تعطیل ہوئی، اور مولٰنا فیض الحسن صاحب دو ماہ کے لئے سہارنپور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناغہ نہ ہو شاگرد نے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا، اپنے والد کو لکھتے ہیں:- "حضرۃ استاذ بہ وطن خویش یعنی سہارنپور تشریف خواہند برد، ایں قدر ناغہ نتواں کرد، مرا ہم عزم سہارنپور است دیگر ہرانچہ مرضی باشد" مولٰنا کے لئے مولٰنا فیض الحسن صاحب کی یہ صحبت بہت مؤثر ثابت ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولٰنا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچایا، مولٰنا فاروق

مرحوم نکتہ آفرینی کے دلدادہ تھے، اور وہ متاخرین شعراے عرب کو جن کا سرخیل متنبی ہی شعراے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالبًا یہی رہا ہوگا، مگر لاہور آئے تو دنیا بدل گئی شعراے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اُتر گئی، یہانتک کہ مولانا نے حماسہ گویا حفظ کر ڈالا، اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے،

جمہرۃ العرب شعراے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی جو مولانا فیض الحسن صاحب کے ذریعہ سے اُن تک پہنچی، اور پڑھی، اور اس کو استاد سے مانگ کر ساتھ لائے، اور مولانا فاروق صاحب کو دیکھنے کو دی، ایک خط میں لکھتے ہیں:- "نامہاے حضرت مولانا فیض الحسن پے درپے می رسند، جمہرۃ العرب از مولوی فاروق صاحب طلب دارد وبہ من بنویس" (نامۂ فارسی ۲۳)

مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا، جو انھیں علی گڈھ آنے کے بعد ملیں، مگر پھر بھی اُس کا تخم مولانا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا، چنانچہ اسی زمانہ کا ان کا ایک عربی خط مجھے ملا ہے جو آگے نقل ہوگا،

مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآنِ پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالبعلموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولانا شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا، ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے، ادھر اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دار العلوم ندوہ میں آکر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا قرآنِ پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیئے،

غرض اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولٰنا فیض الحسن صاحب کے قلیل المدت درس کا نقش علامۂ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا، یہی وجہ تھی کہ استاد مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولٰنا فیض الحسن صاحب کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی، مولٰنا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اُس مرثیہ میں صاف طور پہ نمایاں ہے، جو مولٰنا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالمِ تاثیر میں لکھا ہے، اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہے،

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم — جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسینِ صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد — ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
گہے بے خود بہ برہم گشتنِ بزمِ ہنر نالم — گہے بے خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں،

نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید — عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستاں بودن
بہ آئینِ دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن — بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستاں بودن

مولٰنا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء میں وفات پائی، سید سجاد حیدر صاحب (علیگ) بیان کرتے تھے کہ مولٰنا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ، اور اسی اثر میں ان کا وہ مرثیہ لکھا جو اُن کے کلیات میں ہے،

مولٰنا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے تعلیم حدیث

اُس زمانہ کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم وفنون سے فراغت پا لیتے تھے، تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولٰنا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی، اور جس طرح انھوں نے دوسرے

فنون کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں یگانہ تھے، اسی طرح حدیث کیلئے بھی انھوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا، مولٰنا اپنے شیخِ حدیث کو اکثر "ہمارے مولٰنا" کہا کرتے تھے،

مولٰنا احمد علی سہارنپوری، اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، پہلے ہندوستان میں مولٰنا شیخ وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری، اور مولٰنا عبد الحیٔ تلمیذ مولٰنا شاہ عبد القادر دہلوی سے حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ جاکر حضرت مولٰنا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی، اور سند و اجازت حاصل کی، اس زمانہ میں علماے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس و تدریس کے مولٰنا سہارنپوری کا اہم کارنامہ یہ ہے، کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کرکے چھاپکر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی، مولٰنا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کئے، اُس زمانہ کے اکثر بڑے بڑے علماے احناف محدث سہارنپوری کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کیساتھ عمل، اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی، پہلے کتابوں کی تصحیح و طباعت کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوے، با ایں ہمہ مولٰنا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے، کہ وہ بیحد منکسر، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہوکر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے، مولوی شبلی صاحب مرحوم فرماتے تھے، کہ ایک دفعہ بازار میں مولٰنا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولٰنا کسی طرح اس پر

راضی نہ ہوے اور خود اپنے ہاتھ سے لیکر گھر واپس آئے،

۷، جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو سہارنپور میں وفات پائی،

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی مال و دولت سے بھی متمتع فرمایا تھا، حج سے واپس آکر دہلی میں مطبع قائم کیا، اور کتب حدیث کی طبع و اشاعت فرمائی، اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں سب کچھ لٹ گیا، دو برس تک اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس کمپ میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جاکر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچسو ماہوار کی آمدنی تھی، اس زمانہ میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے نو بجے تک مسجد حافظ جمال الدین صاحب میں جاکر درس دیتے تھے، تقریباً دس برس کلکتہ میں قیام رہا، اس کے بعد جب آپ کی عمر ساٹھ برس کی ہوئی تو استعفا دے کر کلکتہ سے چلے آئے، اور پھر وطن میں بیٹھ کر ہمہ تن درس حدیث میں مصروف ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپکے درس میں بھی برکت بخشی، اور سیکڑوں علما اس فیض سے سرفراز ہوئے،

آپ کی سند حدیث کو ہم یہاں تبرکاً اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ مولنا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ سے ہوسکتی تھی[1]،

سند حدیث | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ہ امّا بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحٰق عفی اللہ عنہ ان الشیخ الناسک الحافظ احمد علی السہارنفوری قد حصّل قراءۃ کتب الحدیث وسمعہا عندی فی مکۃ المعظمۃ زادہا اللہ شرفاً وتکریماً بعد التفصیل ان الحافظ الموصوف قراء طرفا

[1] یہ سند اور مولنا احمد علی صاحب کے حالات میں نے ان کے صاحبزادہ مولنا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری مرحوم سے خط لکھکر منگوائے تھے" س"

من الصحیح البخاری وطرفا سمع بقراءۃ الغیر علی وکتاب تیسیر الاصول و الجامع لابی عیسی الترمذی

وشمائلہ وکتاب النسائی وابن ماجۃ القزوینی والموطا للامام محمد بن الحسن الشیبانی

ومسند ابی حنیفۃ من روایۃ الحصفکی والعدۃ لمحمد بن محمد الجزری صاحب الحصن الحصین

قرأۃ علیّ من اولھا الی اٰخرھا بلا مشارکۃ الغیر فی القراءۃ وکتاب الصحیح لمسلم وسنن ابی

داؤد ایضاً اسندھما علی بتمامھا قراءۃً وسماعۃً ومسند الدارمی قرأ علی قدراً معتداً

وشیئاً من الجامع الصغیر للسیوطی ومشکوٰۃ المصابیح والحصن الحصین والحزب الاعظم

والورد الافخر لعلی القاری وایضاً سمع بقراءۃ الغیر علیّ شرح النخبۃ فی اصول الحدیث وقرأ

علیّ من التفاسیر شیئاً من المعالم للبغوی والبیضاوی والجلالین وجامع البیان و

تفسیر الرحمانی وحصل لی الاجازۃ والقراءۃ والسماعۃ من الشیخ الاجل والحبر الابجل الذی

فاق بین الاقران بالتمییز اعنی الشیخ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ وحصل لہ الاجازۃ

والقراءۃ والسماعۃ من والدہ الشیخ ولی اللہ بن الشیخ عبد الرحیم الدھلوی واسانید

اکثر الکتب موجودۃ فی تصانیفہ وقد اجزت الحافظ الناسک الشیخ احمد علی لقرأۃ

الکتب المذکورۃ ان یشتغل بھا ویعلم المستفیدین بالشروط المعتبرۃ عند اھل الحدیث

واللہ المستعان وعلیہ التکلان واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

۱۲۵۸
محمد اسحٰق

طالب علمی میں مناظروں کا شوق

مولانا کی تعلیم میں منطق کی عملی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ

گفتگو میں منطقی ترتیب، استدلال اور اصولِ مناظرہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے، اور اس حیثیت سے ان کے عہد کے طالب علمانہ حلقوں میں ان کا نام خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ جب طالب علموں کی کسی مجلس میں پہنچ جاتے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی، اور یہ اُس زمانہ کا عام طرز تھا کہ طلبہ میں بات بات پر مناظرے ہوتے تھے، اس طرز میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ تیز اور ذہین طلبہ کی علمی مشق اس کے ذریعہ سے بڑھ جاتی تھی، مسائل زبانی یاد رکھنے کی عادت پڑتی تھی، اور باہمی منافست اور مسابقت میں طالب علم شروح و حواشی پڑھنے، سوال و جواب کرنے، اور ہر روز کچھ آگے بڑھنے کے خوگر ہو جاتے تھے،

مولوی حافظ شاہ تجمل حسین[1] صاحب (دیسنوی بہاری) جو مؤلف کے ہموطن اور رشتہ میں چچا تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی اور بعض بعض مدرسوں میں اُن کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں میرے سامنے دونوں کی ملاقات ہوئی، اور بے تکلفی کی طالب علمانہ باتیں شروع ہو گئیں، مولانا نے حافظ صاحب سے فرمایا کہ "تم تو میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب) پڑھائی تھی"

[1] حافظ شاہ تجمل حسین صاحب مرحوم نے بڑے بڑے علما کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے واقعات و حکایات دہراتے تھے، تو سننے والوں کو بڑا کیف آتا تھا، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے، فکر و غم کبھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا، باتیں بہت ظریفانہ کرتے تھے، ہر محفل اور ہر مجلس میں وہ دلچسپ ثابت ہوتے تھے، اونچے اونچے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کے زمانہ میں بھوپال میں بہ ضمن علما ان کا وظیفہ تھا اور وہیں رہتے تھے، وہ کبھی کسی سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے، اور کبھی کسی کی کڑی سے کڑی بات کا جواب نہیں دیتے تھے، ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب کی مدتوں صحبت اٹھائی تھی، ان کے حالات میں فیض رحمانی وغیرہ کئی کتابیں ہیں، "مولد ابی القاسم" سیرت میں ان کا چھوٹا سا رسالہ ہے، عمر بھر جہاں گردی میں بسر کی، اخیر عمر میں اپنے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں بڑی عمر پا کر، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ کو وفات پائی، اور وہیں وہاں کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے، مکاتیب شبلی فارسی ۹ میں ان ہی حافظ تجمل حسین صاحب کا ذکر ہے،

حافظ صاحب نے جواب دیا "تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ مجھ کو بڑا خفش بناکر اپنی منطق صاف کرتے تھے، پھر حافظ صاحب نے اپنا دوسرا احسان یاد دلایا کہ وہ یاد ہے جو سہارنپور کی جامع مسجد میں تم سے اور مفتی عبداللہ ٹونکی سے مناظرہ ہوا تھا اور پنجابی طلبہ اُن کے ساتھ اور پوربی تمھارے ساتھ تھے، اور آخر مناظر نے مجادلہ کی صورت اختیار کرلی، اور ہم لوگ تم کو اپنی حفاظت میں لیکر قیامگاہ پر لوٹے، وہ یہ کہہ رہے تھے اور مولانا مسکرا رہے تھے،

مولانا نے خود بھی مکاتیب میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو اپنا ہم سبق لکھا ہے (شروانی ۹۱) ہم سبقی سہارنپور میں ہوئی، جب وہ اور مولانا دونوں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے پڑھتے تھے، مفتی صاحب کے صاحبزادہ مفتی انوار الحق صاحب کی کتاب اثبات الوجود پر الندوہ (ستمبر ۱۹۱۱ء) میں لکھتے ہیں :- وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم اور مولانائے ممدوح (مفتی عبداللہ صاحب) ایک ساتھ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے، سہارنپور جانے کے لئے جب مولانا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنؤ پڑی، یہاں اُن کے بعض احباب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے، وہ طالب علموں کے مجمع میں داروغہ حیدر بخش[۱] کی مسجد میں جاکر ٹھہرے اور مناظرے

---

[۱] یہ مسجد لکھنؤ میں چوک کے بیچ میں اب بھی ہے، اوپر مسجد ہے نیچے دکان ہے مسجد میں ایک دو چھوٹے حجرے ہیں، یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے ایک طرف فرنگی محل ہے جہاں عربی کے طلبہ پڑھتے تھے، اور دوسری طرف جھوائی ٹولہ ہے، جہاں طب پڑھنے والے پڑھتے تھے، اس لئے یہاں علوم عربیہ اور فنون طبیہ کے طالب علموں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا، کوٹھریوں میں طلبہ کا مختصر سامان رہتا تھا صحن میں ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا تھا، گو حالات بدل گئے ہیں مگر اس مسجد کی یہ خصوصیت اب بھی کسی قدر باقی ہے، طالب علمی میں سینکڑوں علمائے جید کے قیام کا شرف اسکو حاصل ہے، استاذی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حیدر بخش مرحوم واجد علی شاہ کی کسی بیگم کی سرکار میں داروغہ تھے،

شروع ہوگئے، مولٰنا نے جب اسکات المعتدی لکھی ہے تو اس کے جواب میں مولوی نور محمد صاحب ملتانی نے ۱۲۹۸ھ میں تذکرۃ المنتہی لکھی، اس کے دیباچہ میں مولٰنا کے متعلق عربی میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

"مصنف اسکات المعتدی جب اپنے رامپوری استاد (مولٰنا ارشاد حسین) کے پاس جارہا تھا تو لکھنؤ میں ٹھہرا، اور یہاں طالب علموں کی گرفت میں آگیا تھا، طالب علموں سے مناظرے کرتا تھا، اور اس میں غیظ و غضب ظاہر کرتا تھا اور گفتگو میں بند ہو جاتا تھا، تو جس کا حال طالب علموں کے مقابلہ میں ایسا ہو وہ علماء کے مناظرہ کے قابل؟

مولٰنا جب رامپور پہنچے ہیں تو یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور میں مولٰنا عبدالحق خیرآبادی بن مولٰنا فضل حق خیرآبادی کے سبب سے معقولات کا بڑا شہرہ تھا، ہر طرف منطق اور فلسفہ کے پیچ در پیچ مباحث پر علماء کی آستینیں چڑھی رہتی تھیں، یہی اثر وہاں کے طلبہ پر بھی تھا، مولٰنا رامپور پہنچے تو ہر طرف سے طالب علموں نے گھیر لیا، آخر ہر طرف سے سمٹ کر مولٰنا ارشاد حسین صاحب کے درس میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ "جب مولٰنا شبلی علی گڈھ سے جارہے تھے تو لکھنؤ ٹھہر گئے اور میں وہیں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں اُن سے ملا تھا، اور ان کے چہرہ سے محسوس کرتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) کی خدمت پر دس پندرہ روپیہ کے ملازم تھے، داروغہ اس زمانہ میں نگراں کار کو کہتے تھے، اس زمانہ میں بیگمات جو پاپوش پہنتی تھیں، ان میں موتی ٹکے رہتے تھے، یہ پاپوشیں پرانی ہونے پر داروغہ صاحب کو ملجاتی تھیں، وہ ان کے موتی الگ کرکے جوہریوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے، اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، اور اس سے بڑی دولت پیدا کرلی تھی، ان ہی نے یہ مسجد غالباً ۱۸۶۰ء کے قریب بنوائی تھی، اور مولٰنا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے اس کا افتتاح اپنے وعظ سے فرمایا، مولوی حفیظ اللہ صاحب اسی زمانہ میں مولٰنا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے پڑھنے کیلئے لکھنؤ تشریف لے گئے، اور مولٰنا عبدالحی صاحب کی سفارش سے اسکا ایک حجرہ ان کو رہنے کیلئے ملا، فرماتے تھے کہ اسوقت وہ بالکل تازہ بنی ہوئی تھی،

کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں سے تھے"؛ جس وحشت و بدگمانی کا ذکر مولنا شرر فرماتے ہیں، وہ اسی مناظرانہ عادت کا اثر تھا،

تکمیل | مولنا احمد علی صاحب کا آستانۂ علم مولنا کی آخری درسگاہ تھی، اس وقت سننِ ترمذی کا درس ہو رہا تھا، کہ مولنا کے والد اور خاندان کے بعض اعزہ نے حج کا قصد کیا، مولنا کو بھی اس سفر کا شوق دامنگیر ہوا، مگر ادھر حدیثِ رسول کی کشش تھی، اور اُدھر روضۂ رسولؐ کی، اس کشمکش میں مولنا نے خود اپنے شیخ کو اپنا رہبر بنایا، اور ان سے مشورہ چاہا، فرمایا کہ پڑھنا تو ہر وقت ہو سکتا ہے، اور یہ سفر ہر وقت میسر نہیں آسکتا، چنانچہ مولنا نے بھی عزم سفر کیا، اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہو گئے"

اس وقت مولنا کی عمر ۱۹ برس کی تھی، اور کل مدتِ تحصیل چودہ[1] برس ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ سنہ ۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ سنہ ۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی،

سفر حج ۱۲۹۳ھ سنہ ۱۸۷۶ء | بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ مولنا بھی حجاز کو روانہ ہو گئے، اس واقعہ کا ذکر مولنا نے اپنے اُس قصیدہ کے ایک شعر میں کیا ہے، جس میں انھوں نے ۱۸۹۲ء میں سفر قسطنطنیہ کے واقعات کو نظم کیا ہے،

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدا ے   خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

مولنا کے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض سے ایک مثنوی کے وہ چند شعر ملے ہیں جن کو مولنا نے روضۂ اطہر کے سامنے پڑھا تھا،

---

[1] تذکرہ علماے حال مولوی ادریس صاحب نگرامی مطبوعہ نولکشور، ڈ انگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب غازیپور شائع شدہ مسلم ریویو الہ آباد اگست ۱۹۱۰ء - صـ ۱۵۲،

اے بہ کرم کارِ جہاں کردہ ساز | مرہمہ را پیش تو روے نیاز
چوں بہ درت آمدہ ام با اُمید | از کرمِ خویش مکن نا اُمید
چوں بہ درت آمدم اُمید وار | سایۂ لطفے ز سرم بر مدار

اس مذہبی سفر میں مولنٰا کی علمی تگ و دو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتبخانے ہیں ان سب کی سیر کی، فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا، ابن عبد البر کی کتاب التمہید کا جو موطا امام مالک کی شرح اور حدیث کی دائرۃ المعارف ہی، ایک مرتبہ ذکر آگیا تو فرمایا "میں نے مدینہ منورہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا"

اس سفرِ حج کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے، کہ ایک صاحبِ حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں، تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے، وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے، اور مونچنے سے کانٹے نکال رہے تھے، مولنٰا بھی جاکر سامنے کھڑے ہوگئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پُرسوز لہجے میں یہ شعر پڑھا،

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے | کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہلِ عرب کی فیاضی، سادگی، غیر تمندی، اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا، چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی میں اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتا اور ھلمّوا کہہ کر اپنے پاس کے اور بدوؤں کو جمع کر لیتا اور سب کو تقسیم کر لینے کے بعد خود کھاتا، امتحاناً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابلِ تقسیم

نہ تھی مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلا کر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا تو مولٰنا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا، نہ تمھیں کو مزا ملا، نہ تمھارے کسی ساتھی کو، شتربان نے اس کا جو جواب دیا اس سے عرب کی شرافتِ قومی کا پتہ چلتا ہے، اس نے کہا:- یا شِبلی ھٰذا اعار علینا ان ناکل وَحد نا (اے شبلی اکیلے کھالینا ہمارے لئے عار ہی) مردانہ غیرت و خودداری اور شریفانہ عفو و درگذر کی مثال میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولٰنا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی، ایک بڈھا بدو بار بار ادھر سے گذرتا، اور اس سے گرد اڑتی تھی جو ہانڈی میں پڑتی تھی، مولٰنا کے ایک رفیقِ سفر نے بار بار منع کیا مگر وہ نہ مانا، عاجز آکر انھوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، بدو کے لئے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی، غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہوگئے، یہ بڈھا بدو جوشِ انتقام میں بیتاب تھا، زمین سے تھوڑی سی خاک لیکر کفِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا کہ اس طرح تم کو برباد کردوں گا، مولٰنا نے اُس سے بہت لجاجت سے معافی مانگی تو معاف کیا، بہت ممکن ہو کہ علاّمۂ مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر کی مصوّری اسی واقعہ سے ماخوذ ہو؛

یاری پرسید شبلی راکہ چوں برباد رفت	مشت خاکے در ہوا پیشش پریشاں کردہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ غالبًا ۱۸۹۹ء میں وہ علامۂ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے، ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا،

الرمح لا املأ کفّی بہ	واللبد لا اتبع تزوالہ
نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا	اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی شرح میں مولٰنا نے حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی

کا طریقہ عملاً سکھلایا، تب جا کر اس شعر کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں آیا، فرمانے لگے کہ اہلِ عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں پکڑتے بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں، اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لئے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں، تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے، اسی طرح عملی اور کتابی زبان کا فرق بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ دوران حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو نحو کی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اعراب کا پورا پورا لحاظ رکھتا، یہ دیکھ کر جمال نے آخر ایک روز کہا کہ "یا شبلی انت نحوی" میں نے بوجہ ناواقفیت پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا، مگر بعد کو پتہ چلا یہ تعریض تھی نہ کہ تحسین،

پہلا قومی کام ۱۸۷۷ء جب زمانہ میں مولنا تعلیم سے فارغ ہوئے، دنیائے اسلام میں ایک بہت بڑی تحریک پھیل رہی تھی، وہ "اتحادِ اسلامی" کی تحریک تھی، اس تحریک کے پہلے داعی سید جمال الدین افغانی مرحوم تھے، جنھوں نے آخر میں قسطنطنیہ میں قیام کر لیا تھا، یا قیام کرنے پر مجبور رتھے، بہرحال سلطان عبدالحمید خاں نے جو "سلطان روم" کے نام سے اُس زمانہ میں مشہور تھے، اس تحریک سے فائدہ اٹھایا اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کی حیثیت سے اُن کو ہر جگہ خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین تسلیم کیا گیا، اور اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، جس وقت یہ تحریک اٹھی تو اس نے جس کی حریص نگاہیں آبنائے باسفورس کی زرین شاخوں پر ہمیشہ پڑتی رہتی تھیں، اور جس کی سلطنت میں تین کروڑ ترک مسلمان بستے تھے، جن سے وہ ڈرتا تھا، اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ اس سلطنت کو مٹا کر دم لے گا، انگریز گو باسفورس کے ساحل پر روسیوں کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے،

لیکن دل سے یہ چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط ہونے نہ پائیں تاکہ کروڑوں مسلمان جو اُس کی سلطنت میں بستے ہیں وہ ترک سلطان کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں حالانکہ یہ خیال سراسب سے زیادہ بے حقیقت تھا،

انہی حالات میں ۱۸۷۷ء میں روس اور روم (ترک) کی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان کی فتح ونصرت کی دعا، مانگی جانے لگی، زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے جانے لگے، اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور شور سے تقریریں ہونے لگیں، اور تحریریں لکھی جانے لگیں، مولانا شبلی مرحوم کا آغازِ شباب تھا، اس چنگاری نے ان کے تمام قویٰ کو مشتعل کر دیا تھا، انھوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڈھ میں چندہ جمع کرنا شروع کیا، اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ جن کا نام حسین حبیب آفندی تھا قسطنطنیہ روانہ کیا، اپنے دوست حکیم محمد عمر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- "چندۂ ایں شہر تا بہ دو ہزار و شش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار بیشتر گرد آید . . . . سپاس ایزد کہ روسیانِ تبہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند، ہشت ہزار طعمۂ جحیم شدند، و بست و چہار ہزار زخمہائے گراں بر داشتہ بر بسترِ خاک طپیدند، نسیم فتح وظفر بر پرچم علم سلطانی وزید، و برادر شاہ گرینڈ ڈیوک نکلس از بیم ضربتِ دلیراں ترک از میاں رمید[1]"

سفرنامہ میں لکھتے ہیں: "حسین حبیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ٹرکش کانسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے، کہ محاربۂ روس میں میں نے بحیثیت سکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی" اسی سفرنامہ میں عثمان پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں جو اُن کے سفرنامہ کی تاریخ

ہے، ۱۸۷۷ء کی جنگِ پلونا کے شیر عثمان پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی یاد اُن کے دل میں کس طرح باقی تھی، "یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہِ تیغ کئے تھے، جس کے مقابلہ میں شہنشاہِ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہِ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے، اور بچہ بچہ اس نامور بہادر کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا، لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا[1]" مولٰنا مرحوم کے دل میں اسی زمانہ سے جس اتحادِ اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا واقعات بتائیں گے کہ اخیر اخیر وقت تک وہ ان کے دل سے نہیں نکلا، بلکہ وقتاً فوقتاً اور اندر ہی اندر جڑ پکڑتا گیا،

ان ایام میں مولٰنا کے علمی اور ادبی مشاغل ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۲ء تک

مولٰنا ۱۸۸۲ء تک اعظم گڈھ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا، مگر ان تمام بے اطمینانیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ان کے علمی، ادبی، مذہبی اور قومی مشاغل ہر حال میں جاری رہے،

تعلیم و تدریس کی خدمت ہمارے علماء کی زندگی کا لازمی جزء رہا ہے، خواہ کوئی وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتا کی مسند پر یا اور کسی سرکاری خدمت پر، کیونکہ یہ مشاغلِ دنیا ان کو اپنے

---

[1] سفرنامہ غازی عثمان پاشا کی ملاقات، ۱۲۰

اصلی فرض سے غافل نہیں رکھتے تھے، چنانچہ فرنگی محل کے وہ اکثر علما، جو نوابی کے زمانہ میں افتا، کی خدمت پر مامور تھے، یہاں تک کہ مولنا کے استاذ الاستاذ مفتی محمد یوسف صاحب بھی جب تک لکھنؤ میں مفتی رہے، درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، یہی حال اُس زمانہ کے دوسرے سرکاری عہدہ دار علما، کا تھا، مثلاً مولنا فضل حق صاحب خیرآبادی سررشتہ دار دہلی، مفتی عنایت احمد صاحب، مفتی صدرالدین صاحب دہلی، مفتی سعداللہ صاحب مرادآبادی وغیرہ، یہ سب لوگ اپنے سرکاری عہدوں کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، مولنا کے استاذ مولوی محمد فاروق صاحب کبھی کبھی وکالت کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہیں مقدمات کے کاغذوں کے ساتھ طلبہ کے اسباق کی کتابیں بھی کھلی رہتی تھیں،

شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویو الہ آباد میں مولنا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے اور جس کے واقعات خود مولنا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے:۔ "تکمیل سے فراغت کے بعد انھوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کئے۔"

اُس زمانہ میں مولنا جن لوگوں کو پڑھاتے رہے اُن میں سب سے پہلا اور بڑا نام تو خود مولانا کے ماموں زاد بھائی مولنا حمیدالدین صاحب مرحوم کا ہے، جو عمر میں مولنا سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے، دوسرے صاحب مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم ہیں جو مولنا کے نہایت عزیز اور مطیع شاگرد تھے، ان کی کتابیں پوری نہیں ہوئیں، لیکن ان کا فارسی مذاق بہت اچھا تھا، وہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۸۲ء میں عدالت میں نقل نویس ہوے، اور بعد کو ترقی کر کے ججی کے محافظ دفتر ہو گئے تھے[1]

مولنا کے اکثر پرانے خطوط اور قصائد ان ہی کے پاس محفوظ تھے، تیسرے صاحب وینا پارہ (اعظم گڈھ) کے مولوی محمد عمر صاحب تھے، جو بعد کو جون پور کے مدرسہ میں چلے گئے، مولنا کی ابتدائی فارسی غزلیں اور نامے انہی سے ملے، اسی زمانہ میں اپنے دلی دوست و ہموطن حکیم مولوی محمد عمر صاحب بندولی کو فارسی میں خط لکھتے ہیں :- " دریں فرصت بہ ادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم، و دیوانِ حماسہ بہ دیگرے می آموزم "۔ (مکاتیب ناہمائے فارسی ۷)

معلوم نہیں یہ حماسہ کس کو پڑھاتے تھے، اکبر صاحب اور عثمان صاحب وغیرہ بعض دوسرے عزیزوں کو بھی اس زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھایا کرتے تھے، ۱۰ مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب وینا پاروی کو لکھتے ہیں :- " دریں روزہا دکاں کشادہ ام وتن بہ آموختنِ کساں درداده "۔ (نامۂ فارسی - ۱۳)

اس زمانہ میں مولنا کا دوسرا شغل شعر و شاعری تھا، اس زمانہ کے بعض سربرآوردہ علماء جیسے مفتی صدر الدین آزردہ جو غالب کے ہمعصر اور دوست تھے، فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے، مولنا فیض الحسن صاحب عربی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، مولنا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے، اور نہ صرف شاعر تھے بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے، مولنا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر اٹھا دیتے اور پوچھتے، شبلی بھیرویں سنو گے ؟ پھر گا کر بتاتے، قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جب پُر اثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے فرماتے تھے کہ وہ بھی اُستاد ہی کا فیض تھا، اُس زمانہ میں عموماً فارسی غزلیں کہتے، فارسی قصیدے لکھتے، فارسی نامے بڑی محنت سے انشا کرتے، اور اردو شاعری کا تو اُن دنوں عام چرچا تھا، خود اعظم گڈھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں

پڑھی جاتیں، واہ واہ کا شور بلند ہوتا،

اُن کی اسی زمانہ کی ایک چیز رزمیۂ کابل و قندھار ہے، ۵ صفر ۱۳۰۱ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی اُس کی نقل ہمارے سامنے ہے، اعظم گڈھ میں کوئی انگریز تھا جس نے محاربۂ کابل و قندھار میں شرکت کی تھی، اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا، اُس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کو کوئی اُردو نظم میں ترجمہ کر دے، یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لیا، اردو ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کر لیتے، شروع کے شعر یہ ہیں:-

لو سُنو تیغ و سناں کی داستاں ۔ رایت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں ۔ شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

حکمرانِ بحر و کاں کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

والیِ کابل نے کی جب سرکشی ۔ ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرحِ آشتی ۔ ہو چلا تھا کچھ خیالِ خودسری
روس پر تھا جو گمانِ اختیار ۔ ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سنتے ہی فرمانِ دارائے جہاں ۔ ہو گئی آراستہ فوج گراں
تھا رسالہ آٹھواں بنگال کا ۔ ساتھ جس کے ہم ہوئے تھے رہ گزا

اس کے بعد انگریز افسروں کا اور سفر کی منزلوں کا اور واپسی کا تذکرہ ہے، جنرل ہیبس اور ڈاکٹر رائٹ کے نام اس میں خصوصیت سے لئے گئے ہیں،

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا، اس رد میں جو ان کو غلو تھا، اس کی پرورش میں ان کے اُستاد مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص ہاتھ تھا، بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلے ہیں، بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو، بندول مولانا شبلی کا، اور جیراجپور مولانا سلامت اللہ[1] صاحب کا وطن تھا، مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جاکر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا، اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی، اور اس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آکر ترکِ تقلید اور آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأتِ فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لئے وعظ و تبلیغ شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڈہ کے اطراف میں تقلید و عدمِ تقلید اور ان فقہی مسائل کا شور مچ گیا،

خود مولانا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمید الدین صاحب کے عمِ محترم مولوی محمد سلیم صاحب جو پھریا ضلع اعظم گڈہ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے (مکاتیب میں ان کا ذکر ہے، ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں وفات پائی) ان کے سبب سے گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آکر تفرقہ پڑ گیا تھا،

---

[1] مولانا سلامت اللہ صاحب حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری (استاد جامعہ ملیہ دہلی) کے والد بزرگوار تھے مولانا سلامت اللہ صاحب آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی طلب پر بھوپال چلے گئے تھے، نواب صاحب نے وظیفہ کر دیا تھا، اور بھوپال کے بعض مدرسوں کے اہتمام کی خدمت سپرد کر دی تھی ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں وفات پائی ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب بھی اُن کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں،

غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولٰنا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لئے کمر ہمت چست باندھی، سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی، اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے، اُدھر سے مولٰنا سلامت اللہ صاحب اور رُواں ضلع اعظم گڈہ کے مولوی اسد اللہ صاحب المتوفی ۱۳۳۹ھ جو مولانا عبد اللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، مقابلہ کو نکلے، دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوئے، اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہیئے،

اس عہد میں مولٰنا شبلی مرحوم نے جو رسالے لکھے ان میں سے صرف ایک کا مجھ کو علم ہے اور وہ "ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام" ہے، یہ چالیس صفحوں کا اردو رسالہ ہے، جو سنہ ۱۲۹۲ھ میں کان پور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا تھا، یہ مولٰنا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں ہے، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترکِ قرأت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے اور آخر میں مخالف کے حدیث و فقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے،

اس رسالہ کا دیباچہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

"کیا عبرت کا مقام ہے، کیا افسوس کا وقت ہے، زمانے کا دورِ آخر ہے، اہلِ بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمعِ اسلام سنبھالا لے رہی ہے، ادھر بادِ مخالف کے جھونکے چلنے لگے، اب تک تو خیر تھی کیونکہ وہ شمع ہنوز حمایتِ علما کی فانوس میں

اغیاروں کے دستِ ستم سے محفوظ تھی، لیجئے اب اپنے بیگانے ہو گئے، خود محفل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اُسے گُل کرنے کو دوڑے، وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ[1]

جمعیتِ اسلام برہم ہو چکی تھی، اعدار نے دین کو بیکس و بیچارہ سمجھ کر دستِ تعدی دراز کر رکھا تھا وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بنتے، دینی عزت کو دنیاوی جاہ و وقار کے ساتھ حاصل کرتے، ملحدوں کے تیر بارانِ اعتراضات کو استدلال و احتجاج کی سپر پر روکتے، جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر و منصور رہتا آیا ہے، آج بھی اس کے نقارہ فتح و ظفر کی صدا غنیم کے لشکر میں گونجتی، مگر بیدردوں کو اس سے کیا غرض، انھوں نے نام و نمود کے پیچھے جمعیتِ اسلام کو وہ درہم برہم کیا کہ جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے، اور اسکی مضبوط و پائدار بنا متزلزل ہو گئی، جمعہ جماعت میں تفرقہ پڑ گیا، سب وشتم سے گذر کر طعن و ضرب کی نوبت پہنچی، رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا، اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علما اور مجتہدین کے فیصلے ناقابلِ تسلیم قرار دیئے گئے تھے، اب حکامِ انگریزی نے فیصل کئے فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ،

غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے تھے، سمجھتے اور اس پر کاربند ہوتے، مگر یہاں تو وہ مثل ہی

ع "میں تو ڈوبا ہوں وے تجھ کو بھی لے ڈوبوں گا"

اشتہار جاری ہوے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہب حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں جو جواب دے وہ انعام لے، علمائے حنفیہ کو اول تو درس و تدریس و دیگر مشاغلِ علمی سے فرصت کہاں، دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھایئے تو کس پر، جواب لکھئے تو کس کا؟ اس تمام فرقہ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درسِ نظامیہ کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتداد علما میں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی محدث مرحوم

---

[1] آیت قرآنی میں قصداً تبدیلی کر دی ہے، "س"

وجناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس دیوبند وجناب مولنٰنا محمد عبدالحیّ صاحب وغیرہم کو بہت کم
اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا، ادھریہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجئے مسلمانوں سے

رازِ معشوق نہ افشا ہوجائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

حضرات غیر مقلدین اس بے التفاتی اور عدمِ اعتنا کو دخلِ عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، خم ٹھوک میدانِ مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیہ ان چھوٹی جوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی عالم حنفی نے عنانِ التفات ایک ذرا اُدھر پھیر دی تو مدتوں کے لئے فرصت ہوگئی، ایک انتصار الحق کا جواب مرہٹ کرالٹا سیدھا آٹھ دس برس میں تیار ہوا، سو بھی کیا، کاغذ بادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہرچند اس شور وفتنہ انگیزی پر بھی ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ (شعر سعدی)

چو باسفلہ گوئی بہ لطف وخوشی فزوں گردوش کبر وگردن کشی

مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دار وگیر کردی جائے، اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جائے،

اصل مقصود

واضح ہو کہ اس فرقۂ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن وحدیث کے پیرو ہیں، اور بہ مقابلہ حدیث نبوی کسی امام ومجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے، اس رسالہ میں بہ ضمن مسالہ قرأتِ فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے، ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قرآن وحدیث سے صاف صاف ثابت ہے، پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چونکہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف

ہے، اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل از راہ فریب و مکر ہے، دوسرے یہ کہ حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کس قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دامِ فریب میں پھنساتے ہیں، اے برادرانِ اسلام اس رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمہیں ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں تو ان سے بیزار ہو جاؤ، اور پھر ان کے دامِ فریب میں نہ آؤ،

امرِ اوّل واضح ہو کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے واجب ہے، ہر نماز میں خواہ وہ سری ہو خواہ جہری، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو کسی قسم کی نماز میں قرأتِ فاتحہ کرنا مستحب بھی نہیں اور واجب کا تو کیا مذکور، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا مدعا ثابت اور اُن کا دعویٰ باطل ہوتا ہے "

اس مقدمہ کو میں نے یہاں اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڈھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا، نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سر سید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا، دعویٰ اور دلیل کی ترتیب اور اُلجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھا کر کہنے کا سلیقہ ان میں فطری تھا، تیسری بات، اس سے اُن کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے جو اس نازک زمانہ میں باہمی فرقہ آرائیوں سے اُن کے دل کو پہنچا تھا،

احناف میں مولانا ابو الحسنات عبد الحئی صاحب فرنگی محلی "قرأتِ خلف الامام" کے مسئلہ میں ایک معتدل روش رکھتے تھے، یعنی ان کو اس مسئلہ میں وہ غلو نہ تھا جو اس زمانہ کے دوسرے علمائے احناف کو تھا، مولانا موصوف نے ۱۲۹۴ھ میں "امام الکلام فی ما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام"

کے نام سے ایک مفصل کتاب بطور محاکمہ کے لکھی تھی، اور اس میں فقہاے اربعہ کے مسلک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، اور نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہی، جیسا کہ سمجھا جاتا ہی، بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں، اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہی نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہی کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے، آخر میں مولٰنا عبدالحیٔ صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی ہی، کہ جہری میں امام کے سکتات میں یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو، اور سرّی میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے،

عام علماے احناف کی طرح مولٰنا شبلی مرحوم کا یہ خیال تھا کہ امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہی، اسی بنا پر "اسکات المعتدی علی انصات المقتدی" کے نام سے ۴۲ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا اور مشہور مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۹۰ھ میں اُس کو چھپوایا، اس کے چھپوانے کا خرچ ان کے چچا شیخ مجیب اللہ نے اپنے ذمہ لیا (نامۂ فارسی ۲۴) رسالہ چھپا اور شائع ہوا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، یہاں تک کہ ہندوستان سے نکل کر مصر و شام اور روم تک پہنچ گیا، ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا تو اس رسالہ کے مصنّف کی حیثیت سے بعض علماء نے اُن کی بڑی قدر کی تھی، مولٰنا نے اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کا خود ذکر کیا ہی، (ص ۳۶)

اس رسالہ میں مولانا شبلیؒ نے متن میں قال بعض العلماء لکھ کر مولٰنا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا، اور بین السطور میں مولانا عبدالحیٔ صاحب کے نام کی بھی

تصریح کردی تھی، لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، رسالہ کی زبان بہت ہی ادیبانہ ہے، دیباچہ میں مشکل الفاظ قصداً لائے گئے ہیں، جو خاص مولنا فاروق صاحب کا ڈھنگ تھا۔

یہ رسالہ جب مولانا عبدالحیٔ صاحب اور اُن کے شاگردوں تک پہنچا تو اُنھوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولنا عبدالحیٔ صاحب کے شاگرد مولنا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا، رسالہ کا نام "تذکرۃ المنتہی فی ردّ اسکات المعتدی" ہے، ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ "الافادات فی ردّ الاسکات" ہے، اور تیسرا "التنبیہات علی ہفوات الاسکات" ہے، چوتھا رسالہ "الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات" حافظ ملا شعیب حنفی کابلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اسکے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد و عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے، گو خود مولنا عبدالحیٔ صاحب نے اس رسالہ کا براہ راست جواب نہیں دیا، لیکن چند سال کے بعد انھوں نے اپنے رسالہ "امام الکلام" کو دوبارہ چھپوایا تو غیث الغمام کے نام سے اُس پر ایک حاشیہ بڑھایا جس میں منجملہ اور دوسری باتوں کے مولنا سے تعرض کئے بغیر اُن کے اعتراضوں کے جواب دیئے ہیں،

مولانا فرماتے تھے کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ مولنا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی سے جاکر

---

[1] ایماضات کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے "لکنہ لما کان ظن العوام انہ قد اصاب فی مارام علی انہ لا یکاد ان یحوم حول المرام، صرفتُ الیہ عنان العنایۃ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مولنا شبلیؒ کے رسالہ کو پسند کیا تھا، اور اس کی مقبولیت ہو چکی تھی،

ملا تھا تو مولنا ممدوح نے احناف کی باہمی خانہ جنگی پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ ہم آپس میں لڑتے ہیں اور اہلحدیث کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ کس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہتے اور کام کرتے ہیں، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ "مولنا کا اشارہ میرے رسالہ کی طرف تھا، اس لئے مجھے ندامت ہوئی"

اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جو ان کے فضل وکمال کا طرۂ امتیاز تھیں موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب وحسنِ استدلال اور دوسری عربی انشا پردازی، اسی لئے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے انھوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے، مولانا ان جوابی رسالوں کے جواب کے لئے بھی پوری طرح تیار تھے: نامۂ فارسی ۱۴ میں، ۷، اکتوبر ۱۸۸۲ء کو لکھتے ہیں:-

"انشاء اللہ در اندک زمانے از عہدۂ ردِّ تذکرہ بدر می آیم، مردماں گویند کہ ایماضات و رسالۂ دیگر ہم از حافظ صاحب است، تاحال بر علم واستعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم، اکنوں آں ہم برخاست، انشاء اللہ در قریب وقتے بہ غازی پوری رسم ودریں اغلاط و پا لغزہاے مصنفِ تذکرہ وایماضات ہمہ باز خواہم گفت"

اس تذکرہ اور ایماضات سے اوپر کے وہی دونوں رسالے مقصود ہیں،

اردو زبان وادب کی طرف گو ان دنوں مولنا کی توجہ بہت کم تھی، پھر بھی مولنا کے شباب کا یہ عہد وہ تھا جب لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے اور ہر قسم کے اخبارات اور رسالے نکلنے لگے تھے ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم کا ظریفانہ اخبار اودھ پنچ نکلنا شروع ہو چکا

تھا، اس زمانہ میں اس اخبار میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر مضمون لکھا کرتے تھے، اخبار سیاسیات میں کانگریس کا حامی تھا، اور سر سید کی مخالفت میں نہایت شوخ مضامین لکھا کرتا تھا، مولانا مرحوم اس اخبار کو اُن دنوں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور زبان کا لطف اٹھایا کرتے تھے، میر اکبر حسین (یعنی اکبر الہ آبادی) سے مولنٰا کی واقفیت اسی اخبار کے ذریعہ علی گڈھ جانے سے پہلے ہو چکی تھی، اور اودھ پنچ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں مولانا کو اخیر زمانہ تک یاد تھیں اور خود مجھے سنائی تھیں،

اس زمانہ میں لکھنؤ سے اردو غزلیات کا ایک دلچسپ ماہوار گلدستہ **پیام یار** کے نام سے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے، چوک میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے پاس ان کی دوکان تھی[1]

---

[1] مرزا محمد عسکری صاحب بی اے (لکھنؤ) مترجم تاریخ ادب اردو جو مولنٰا کے پرانے ملنے والے تھے، اپنی اس کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: "منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر "پیام یار" مولنٰا کے ایک بے تکلف دوست تھے، انکی چوک میں عطر کی دکان تھی جب مولنٰا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے، اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے، یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی عبد الحلیم شرر، شوق قدوائی، لڈن صاحب خورشید، ابو صاحب جلیس، سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور اور بے تکلف احباب جمع ہوتے، اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، وزیر تنبولی کی خوش ذائقہ گلوریوں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کی جاتی کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھیں مچکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے، اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے، ایک دن جب کہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولنٰا بھی تشریف فرما تھے، شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی، وقت ۷-۸ بجے شام چوک میں بڑا مجمع تھا، تعزیئے معہ جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے، شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی، سب لوگ اس سیر میں مشغول، مگر مولنٰا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلہ میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی، اس قدر مشغول و منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے تا آنکہ پوری کتاب اسی حالت

اور مسجد کی سامنے والی گلی میں اُن کا عطر کا کارخانہ تھا، اور اسی میں اُن کے اس گلدستہ کا بھی دفتر تھا، جو ہر مہینہ مشام روح کو اپنے کلام سے معطر کرتا تھا، مولانا اس کو بھی پڑھتے تھے، اور شاید اسی تعلق سے انہی منشی نثار حسین صاحب کے ذریعہ سے مولانا کی مثنوی "صبح امید" اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پہلی دفعہ چھپی،

اس زمانہ کی بعض اردو غزلیں مکاتیب میں ملتی ہیں اور بعض پرانے شاگردوں کی بیاضوں میں نقل ہیں،

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا، جو اس زمانہ میں بھی موجود تھا، گو اس زمانہ کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا، فرماتے تھے کہ اعظم گڈہ میں کتابوں کی کوئی دکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے، یا دواوین دیکھا کرتے، اس زمانہ کے خطوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، مولوی محمد عمر صاحب دیناپاری کو فارسی میں، ۷ ار مارچ ۱۸۸۱ء کو بستی سے جہاں وکالت کر رہے تھے، جون پور لکھتے ہیں:

"در آنجا کتابہائے نایافت فراہم آرند" (نامۂ فارسی ۱۳)

ابن ابی حجلہ تلمسانی حنفی المتوفی ۷۷۶ھ کی ایک تالیف کا نام دیوان الصبابہ ہے، اس میں اس نے عرب عشاق کے واقعات اور عشق و محبت کی لطیف عربی نظمیں اور غزلیں جمع کی ہیں، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا شبلی کے پاس تھا، جو اس وقت دار المصنفین میں ہے، اس دیوان کے اوراق میں مولانا کے دست خاص کا ایک عربی خط کسی کے نام لکھا ہوا رہ گیا ہے، اس نسخہ پر سعد الدین حیدر علوی ۱۲۳۹ھ کی مہر ہے، اور آخر میں سعد الدین حیدر صاحب

کی تحریر ہے کہ "یہ نسخہ میرے ماموں سید محمد حسن خاں نے ۱۲۴۴ھ میں مجھے عنایت فرمایا" بہرحال اس دیوان کے اوراق میں مولانا شبلی مرحوم کی حسب ذیل عربی تحریر ہے،

سلام علیکم	سلام علیکم
هذا دیوان الصبابة یصل الیکم،	یہ دیوان الصبابہ آپ کے پاس جا رہا ہے، میں خود
واما انی فلا یمکننی حضور	نہ آسکوں گا، اس لئے نہیں کہ میں کسی غیر مفید شغل
ندیکم لانی اشتغلت بامور	میں مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے
غیر طائلة وقعدت همتی، و	اور میں نے عنانِ توجہ دنیائے دنی کی طرف موڑ
صرفت عنان العنایة الی الدنیا	دی ہے، اور علم وادب میں حصولِ کمال کی کوششوں
الدنیة وبرئت من تحصیل	سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھالی ہیں بحمداللہ
کمال العلم والادب ذمتی، فانی	اس طرح بنا ہوں کہ فضل وکمال کے حصول
بحمد الله خلقت وکسب	کا جذبہ میرے خون میں ملا ہے، جو انشاءاللہ مجھ
الفضل سیط من دمی، فهو لا	سے نہ جیتے نہ مرتے کبھی جدا ہوگا، بلکہ میرے
یفارقنی ان شاء الله فی حالتی وجودی	نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے جو یہ معمولی
وعدمی، بل لانی لملازمتی هذه	سی ملازمت کرلی ہے اس کے سبب سے میں
العهدة الرذیلة ادوم التفکر	ہمیشہ اپنی نسبت سوچا کرتا ہوں، اس سے
فی حالتی، فیزید همی ویزداد ملالی	میرا حزن وملال بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے
وبیدکم الانصاف، ماهذا	ہاتھ میں ہے، اور میری نسبت اس کے سوا

الا البؤس والاعتساف فصبر	کچھ سمجھنا صریح ظلم ہے، صبر اس حالت میں
جمیل وھو حسبی ونعم الوکیل،	خوب ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے،
(۱۲ ش نعمانی)	اور کیسا کارساز ہی،

یہ خط غالباً ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء کا ہے، کیونکہ مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ش نعمانی" کرکے دستخط وہ اسی زمانہ میں کرتے تھے، اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُن کی عربی انشار اسی زمانہ میں کیسی صاف، و بحیب فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی، اور جو ہندوستانیت اور متاخرین کے تکلفات باردہ سے بالکل پاک ہے، دوسرے نادر کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ ان کا مرغ ہمت اپنے لئے ہمیشہ کسی بلند آشیانہ کا طالب تھا،

اسی دورِ ابتلا میں ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آوردہ ام سزاے آن است کہ سررشتہ اش بہ این چنین کار پابند باشد، دیگراں نہ دانم تا در سر چہ دارند من خود دریں خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ بایں ہمہ خوار ہیما ہماں شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بختم یاوری کرد ہماں خواہم بود کہ ہستم" (نامۂ فارسی ۱۲)

وکالت کی تعلیم ۱۸۷۹ء و ۱۸۸۰ء

ہر باپ کی طرح مولنا کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ پڑھنا پڑھانا جو اُن کے نزدیک بے شغلی کا ایک کام تھا چھوڑ کر وہ کسبِ معاش کی طرف متوجہ ہوں، اور اسکے لئے مولنا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا کیونکہ اعظم گڈھ میں اس وقت مولنا کے والد اور ماموں بڑے کامیاب وکیل تھے اس لئے قدرتی طور پر مولنا کے والد نے یہی شاہراہِ عمل ان کے لئے تجویز کی، مگر خود مولانا کی بلند فطرت

اور مذاقِ سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"از تطاولِ دہر بہ حفظِ قانون مشغول ہستم، سلیم سروی ہم دریں کار ماند" (نامۂ فارسی - ۸)

باایںہمہ باپ کے حکم سے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ قانون کی ورق گردانی شروع کی، ہر روز کچھ قانونی دفعات یاد کر لیتے اور اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کو جو اس زمانہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے، سنا دیا کرتے، امتحان کا وقت آیا تو مولانا امتحان دینے کے لئے تیار نہ تھے، مگر والد کے اصرار سے امتحان کی فیس بھیجی گئی، اتفاق یہ کہ اتنی ہی تیاری پر مسٹر مہدی مرحوم کو بھی تفریحاً امتحانِ وکالت میں شرکت کا خیال پیدا ہوا، اور فیس بھیجدی، حالانکہ نہ اُن کا ارادہ وکالت کا تھا، نہ انھوں نے پوری تیاری کی تھی، صرف مولانا کے اسباق سُن سُن کر کچھ مسائل حافظہ میں رہ گئے تھے،

مولانا کو غالباً اپنے جوابی پرچوں کی کمزوری کا احساس تھا اس لئے امتحان دے کر وہ الہ آباد میں کالون صاحب سے جو اُن کے والد کے دوست تھے اور جو اُن دنوں اس امتحان کے ممتحن ہوا کرتے تھے ملے، لیکن جب اُن سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سال ممتحن نہیں تو ملول ہوئے، دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا،

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم　　　　ایں قدر ہست کہ تغییرِ قضا نتواں کرد

اس شعر نے اور بھی افسردہ خاطر کیا، اور لوگوں کا یہ طعن کہ انگریزی کے بغیر کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، اپنے بھائی مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں :-

"چناں کہ اللہ دی با کالون صاحب برخوردم، از نام و نسب پرسید، ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد"

معذرت خواست کہ امسال صحفِ اردو نگریستن نہ خواہم، دل زدہ بخانہ رسیدم، واز دیوان غیب تفاول خواستم ایں شعر بر آمد۔

انچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم   ایں قدر ہست کہ تغیر قضا نتواں کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوے حرماں نشستم، ہمانا در دل خواہی گفت کہ بایں ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن و کاسۂ آرزو بر سر پایں شکستن یعنی چہ؟ مگر چہ تواں کرد کہ سر بسنگ آمد، و فسحتانۂ دل از تراکمِ افکار تنگ آمد، دو سہ سالے است کہ پائے طلب در دامن کشیدم و بچیزے نہ رسیدم، عزیزاں گویند کہ بغیر از تعلم انگریزی نخواہی بسر برد، و ایں خود چہ حرف است، جمعے را بیں کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند، و باز بمناصبِ جلیلہ می رسند، آخر در تحصیلداری وغیرہ او خود مشروط نیست، فی الجملہ ستیزۂ چرخ و آویزشِ بخت برآنم آورد کہ لختے از عمر بہ بادیہ پیمائی و ہرزہ درائی گذارم[1]۔ بہرحال نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا، مولانا امتحان میں ناکامیاب رہے اور عجیب بات یہ کہ مہدی حسن پاس ہوگئے، اس واقعہ سے مولانا کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی اور تہیّہ کر لیا کہ اب وکالت پاس کرہی کے دم لیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے پہلے قانون کی ایک ایک کتاب کو بالاستیعاب پڑھ کر اصولی کلیات مرتب کئے، اور دفعات کے جزئیات کو محفوظ رکھنے کے خیال سے چند مختصر اشارات وضع کئے، اس طرح پر ایک اپنا خلاصہ مرتب کیا، اس دماغی کاوش کی بدولت مسائلِ قانونی پر خود عبور ہوگیا، اور دوسرے سال ۱۸۸۰ء میں پاس ہوگئے، مولانا کا یہ خلاصہ اتنا کارآمد ثابت ہوا کہ اس کی مدد سے اُن کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے

---

[1] مکاتیب نامہ ہاے فارسی ۔ ۴

اعظم گڈھ میں وکالت ۱۸۸۱ء

کامیابی کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ ہوئے، مگر اس راہ میں اُن کی ایمانداری اور سچائی کی بنا پر ہر قدم پر اُن کو مشکلات کا سامنا ہوا، اُن کے یہ دن عجیب کشمکش میں گذرے، علی گڈھ جانے کے بعد ۱۶ جنوری ۱۸۸۴ء کو اپنی موجودہ چھوٹی نوکری سے گھبرا کر دوبارہ وکالت کا خیال کرکے کانپتے تھے، اپنے چچا کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "والد قبلہ را جز بوکالت روئے دراہے نیست و بایں آزادہ دلی اگر بوکالت نساختہ باشم در نظرِ انصاف مرا دریں میانہ گناہے نخواہد بود، در ظلِّ والد قبلہ ہستیم ہمچنیں خواہد بود، آہ! ازاں ہنگام کہ دولت روئے گرداند و کار بدستِ من افتد و دراں آشوب، وسے بر جائے ندارم و خواست و ناخواست روے بہ وکالت آرم و خویش را اندازہ نہ نہم، مردماں را بہ ہرزہ و لاف فریب دہم و ایں خواری بخویش درپذیرم و ہم بدیں ذلّت و خستگی حسد و شکم باز رہم۔" (۳) بہر حال مولانا نے والد کے کہنے سے ۱۸۸۱ء میں اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی، مگر اس عزم اور ارادہ کے ساتھ کی کہ ایک حرف بھی حق و صداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبہ نہیں سکتی تھی، چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کردی کہ اس ورع و تقویٰ کے ساتھ اُن سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے چل نہیں سکتا،

ملازمت ۱۸۸۲ء

وکالت کے بعد پڑھے لکھے آدمیوں کا شغل ملازمت سمجھا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، نواب وقار الملک وغیرہ بہت سے مشہور اکابر قوم نے انہی معمولی ملازمتوں سے ترقی پائی تھی، اشیخ

صاحب کا خیال بھی قدرتی طور پر اسی جانب مائل ہوا، اور مولانا کو عدالتِ کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت دلوادی، تنخواہ دس روپیہ ماہوار تھی، جس میں سے نو روپیہ تو مکان سے کچہری تک کرایۂ آمد و رفت میں اُٹھ جاتے تھے، اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی، اور امانت کے فرائض اس دیانت سے انجام دیئے کہ اہلِ معاملہ کے ہاں پانی پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایۂ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر اور جھلسا دینے والی دھوپ میں روزہ رکھے ہوئے گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرا کرتے تھے، افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا، سائیس دال چاول اُبال دیتا اسی کو کھا لیتے، ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے،

چنانچہ اپنے ایک عزیز کو اُسی زمانہ میں ۲۵ اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط لکھا ہے، جس میں فرماتے ہیں:۔ "ما ہمہ دو در کارِ امانت روز از شب نشناختم و در راہ طلب از غایتِ جد و جہد تاب و تواں در باختم غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بآمیزش کسے نمی دادم اکنوں از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار و خس افتادہ است، مگر من و خدائے من کہ ایں ہمہ محنت پژوہی و نفس گدازی

از آں دوست تر دارم کہ تر ہاتے چند درہم با فند و دروغ راست مانا راپیش کساں جلوۂ ظہور و فروغِ قبول دہند" (نامہ فارسی ۲۰) مولٰنا مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اور محنت و دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے، مگر ان کو افسروں کی درباداری کا سلیقہ کہاں تھا، اور اس کے بغیر ملازمت اور وہ بھی ماتحتی کی ملتی کیونکر، اور مل بھی جائے تو چلتی کے دن، چنانچہ امانت کے اس چند روزہ دوادوش کا انجام خود انہی کی زبانی سنیئے، اسی خط میں فرماتے ہیں:۔ "دہر چند در

راہ پرخطر دو اسپہ تاختم و در آنجا ایں کار بہر کس و ناکس ساختم مگر بایں ہمہ بجائے نہ رسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامنِ قناعت کشیدم فرمانِ تقرر ہم نہ دادند تا بہ سند کار گذاری چہ رسد" (نامۂ فارسی ۲۰)

نیل کا کام ۱۸۸۲ء

مولانا کے والد زمینداری کے ساتھ نیل سازی کی تجارت وسیع پیمانہ پر کرتے تھے اور اپنے علاقہ میں نیل کے متعدد کارخانے (جو ان اطراف میں گودام کہے جاتے ہیں) کھول رکھے تھے، مولانا کی بے شغلی دیکھ کر اُن کے والد نے اس کام کی نگرانی اُن کے سپرد کی، صبر و شکر کے ساتھ کچھ دنوں یہ کام بھی سرانجام دیا، ایک دوست کو لکھتے ہیں:" چو ازیں کشمکش فارغ نشستم دیگر روے داد یعنی کارم بہ گودام و متعلقاتِ او افتاد و ہر چند آں چناں کارے سزائے ایں ہیچ کارہ نبود، مگر مرا از امتثالِ امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نہ بود" (۴۴ نامۂ فارسی)

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ‏ ‏ ‏ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بستی میں وکالت اخیر ۱۸۸۲ء

اس زمانہ میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ویدپوری منصف تھے وہ اتفاق سے اعظم گڈھ آئے اور مولانا کو وکالت کے لئے اپنے ساتھ بستی لے گئے، چنانچہ ۱۸۸۲ء میں چند مہینے بستی میں وکالت کی،

مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی پر اپنا آپ تبصرہ

خوش قسمتی سے ہم کو مولانا کا ایک خط جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو سید محمد فاروقی صاحب شاہپوری کے نام لکھا گیا تھا مل گیا ہے، مکتوب الیہ نے یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپوایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:" علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا، خاندان میں علم کا چرچا تھا، اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے، اُس زمانہ

کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پہ سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا، یہ خاص التزام رہا (اور اس میں میں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصولِ فقہ کے لئے ان ہی علمار کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا، جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارن پوری، ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہور میں،

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا، چند روز وکالت کی لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی، اور علمی اشغال میں مصروف ہوا، اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اوّل علی گڈھ کی پروفیسری للعٹ ماہوار ... ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا، اور یہ فطرت تھی۔" مولنا ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور وکالت سے بعدِ عدم مناسبت کے سبب تنگ دل رہتے تھے، بایں ہمہ اُن کی بلند نظری اور علوے ہمت اُن کو اُن کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی تھی، ۲۵ راگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بایں ہمہ خوار ہیاہماں شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بخجم یاد آوری گردہماں خواہم بود کہ ہستم۔" (نامۂ فارسی ۲۰)

علی گڈہ کا سفر ۱۸۸۳ء اور سرسید سے ملاقات

آخر وہ وقت بھی آگیا جو اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کے لئے مقرر تھا، علی گڈہ کی تحریک اس زمانہ میں سب سے پُرزور تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، سرسید مرحوم چونکہ مشرقی اضلاع

میں بہت دنوں تک رہے تھے، اس لئے اس تحریک نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کافی اثر پیدا کر لیا تھا، اور خود مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی ہو گئے تھے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں انگریزی پڑھانا شروع کیا، اور ان کو علی گڈہ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے، اور وہیں سے اُس سال انٹرنس پاس کیا، اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لئے علی گڈہ تشریف لے گئے، منادیِ غیب نے آواز دی "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم"۔ مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے، سر سید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سر سید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اُس کے تیور، زبان، اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڈہ گزٹ (مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۱ء[1]) میں چھپوا دیا،

المجد یصحب علما حیثما یصل	والعلم عن قومنا لازال یرتحل
بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے علم کو بھی ساتھ	لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے
نالوا من الذل مالا نالہ احد	اذ لا یری فیھم علم و لا عمل
ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل	نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ان میں نہ علم نظر آتا نہ عمل
ولا تزال تری ینبثّ شملھم	فی کل یوم و قد ضاقت بھم حیل
اُن کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور اُن کیلئے تمام	راستے بند ہو گئے ہیں

[1] علی گڈہ گزٹ مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶ نمبر ۴۲ ص ۱۱۷۵،

لا يرغبون الى ما كان ينفعهم — فجلّ صنعتهم للغي والخطل

مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان نہیں ہے — ان کا تمام تر کارنامہ گمراہی اور پریشان رائی ہے

ترٰنهم اليوم في كابٍ وفي قلقٍ — فلا افاد فتيلا ما به اشتغلوا

آج تم اُن کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو — انکے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا

لا ينتهون وقد ذاقوا وبالهم — عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا

باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن — ان سے باز نہیں آتے نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں

وهل يجازيهم الا بما اكتسبوا — من كان من عنده الاحكام تنفصل

خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا — اُن کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا

فمن سعى اليوم في اصلاح حالهم — فالله جازيه يوما يقطع الامل

پس جس شخص نے انکی اصلاح کے لئے کوشش — کی خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا

ان كنت تسئلني من هذه صفته — قلت الامام الهمام السيد البطل

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہونگا — امام سردار، بہادر سید،

هو الذي فاق في الآفاق منزلةً — ونال مالم تنله الاعصر الاوّل

وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ — بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی

من اقبل الدين والدنيا عليه معا — والان في نجح ما قد رام مشتغلٌ

جسکو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک — اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے

نال المكارم من آبائه ومضى — في المكرمات على آثار ما فعلوا

اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کئے اور اس شاہراہ میں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلا

فجدّہ سیّد الاعراب والعجم ۔۔۔ قد قال یا امتی لما دنا الاجل

اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے اور انکی موت کا وقت آیا تو صرف یا امّتی کا لفظ اُنکی زبان سے نکلا

وھکذا اُصْنُعُ ھذا السیّد العلم ۔۔۔ یقول یا لھفَ قومی یسئی ما عملوا

اسی طرح اس نامور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، بُرا کیا،

یا خیر من سیط حب القوم من دمہ ۔۔۔ احسِنْ ولا تبتئس من سوء ما عملوا

اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہو گئی ہے عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں ان سے غمزدہ نہ ہو

اَحْسِن الیھم ولو جازوك سیئۃً ۔۔۔ ولا تبال بما قالوا وما فعلوا

ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ وہ کریں اسکی پروا نہ کر

اس قصیدہ میں اگرچہ فن کی بعض کمزوریاں ہیں، لیکن اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب یہ طرز ہندوستان میں مفقود تھا اور متنبی وغیرہ شعرائے متاخرین کے تتبع کے سوا ہندوستان کے علمائے ادب کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، ادب عربی کی یہ نئی شاہراہ جو مولٰنا فیض الحسن صاحب کی رہنمائی سے اُن کو نظر آئی خاص توجہ کی مستحق ہے، اس قصیدہ میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر خالص عرب شعراء کے کلام کی نقل کرنا چاہتا ہے، قصیدہ میں سرسید کی صرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک اُن کے حسب و نسب و سیادت کی، اور دوسرے اُن کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی قسم کا مدّاحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح گداگرانہ ذلت و ابتذال نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی، علوئے نفس، اور ذہنی برتری کو ظاہر کرتی ہے

غالباً اس پہلی ملاقات کا ہلکا اثر سرسیّد کے دل و دماغ پر اس لئے بھی رہ گیا ہوگا کہ وہ مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سے پوری طرح واقف اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی کے فضل و کمال کے خوشہ چیں تھے۔

علی گڈھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء

اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلّم کی ضرورت ہوئی، اس وقت اس دھندلی سی یاد کو تیز کرنے کا موقع آیا، مولانا فیض الحسن کی تصدیق و توثیق سے درخواست بھیجی اور بستی سے جہاں وہ وکالت کر رہے تھے، لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڈھ گئے،[1] اس زمانہ میں محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے ڈپٹی محمد کریم صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، مولٰنا علی گڈھ جا کر ڈپٹی صاحب کے یہاں مقیم ہوئے اور ڈپٹی صاحب کی وساطت سے سرسید کے عزیز دوست اور رفیقِ کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں[2] سے ملے، انھو

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے مولانا کی وفات پر جو مضمون دلگداز میں لکھا تھا اس میں اس موقع پر لکھتے ہیں، علی گڈھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انھوں (مولنا شبلی) نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی، سید صاحب نے مولنا کی درخواست کو قبول کر لیا، چنانچہ مولنا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڈھ گئے ہیں اس وقت داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا

[2] مولوی سمیع اللہ خاں دلی کے عمائد سے تھے، عربی کے فارغ التحصیل عالم، مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے شاگرد، ان کی قانونی نکتہ سنجی مسلم تھی، اولاً ہائی کورٹ میں وکالت کی، نامور ہوئے، انگریزی داں وکلا آئے تو یہ طبقہ ہٹا، سب ججیاں ان کو دی گئیں، مولوی صاحب کا باوجود دیوانی حاکم ہونے کے رعب اس قدر تھا کہ سارا ضلع مرعوب تھا، ایک بار پنڈت اجودھیا ناتھ کو بحث کرتے وقت سرِ اجلاس ڈانٹا اور پنڈت نے معافی چاہی، بہت وجیہ اور شاندار، دارالسلطنۃ کے اعلیٰ شرفا کا نمونہ تھے، سرسید کے دستِ راست، آخر میں دونوں میں بعض مسائل میں سخت اختلاف ہوگیا، اور وہ

نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، اور سر سید سے ملایا[١]،

بہرحال دونوں کی پسند سے مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک[٢] پروفیسر کے عہدہ پر جنوری ۱۸۸۳ء کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپئے ماہوار پر ہو گیا، اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج کا کام شروع کیا، کالج میں ایف اے اور بی اے کے لڑکوں کو فارسی اور انٹرنس اور سکنڈ کے لڑکوں کو عربی پڑھانے لگے[٣]، کالج کے فارسی کورس میں ان دنوں درۂ نادرہ اور دیوانِ عرفی شامل تھا یہی دونوں کتابیں پڑھانے کو ملیں[٤]،

بہرحال اُس وقت چالیس روپیے ماہوار کی نوکری مولانا کے حساس دل کے لئے ایک تپش چھپا زخم تھا، اسی زمانہ میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:- "ایں جا کہ آرمیدہ ام و ایں مذلت بر خود پسندیدہ، نہ دانم کہ تا چرخ را دریں پردہ چہ نیرنگہا است[٥]" مولانا ایک دفعہ فرماتے تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) علی گڈھ سے علیحدہ ہو کر الہ آباد چلے آئے، اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی کے قریب مسلم ہوسٹل کی عمارت بنوائی، جو اب تک یادگار ہے، ان کے صاحبزادہ نواب سربلند جنگ بہادر مرحوم تھے، (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) [١] مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے مولانا کی وفات پر ۲۰ رجنوری ۱۹۱۵ء کے علی گڈھ گزٹ میں اس موقع پر لکھا ہے: "نوجوانی میں علی گڈھ تشریف لائے، خان بہادر محمد کریم اس زمانہ میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے، مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا، کتنے آدمی ان کی جوہر شناسی کے بدولت کیا سے کیا ہو گئے، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لئے انتخاب کر کے سر سید احمد خاں کے سامنے پیش کیا" [٢] اس وقت کالج میں عربی پروفیسر مولوی محمد اکبر صاحب تھے [٣] مکاتیب فارسی ۵ [٤] مکاتیب فارسی ۲۵ [٥] مکاتیب فارسی،

میں مولنا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر آنکھ پر نم ہوئے بغیر نہ رہی، بہر حال چونکہ علمی شغل تھا اور علمی صحبت، اس لئے اس لذت کے لئے انھوں نے اس تلخی کو گوارا کیا، آگے چل کر مولنا کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار ہوگئی، اور عربی کے پروفیسر ہوگئے، اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے، کالج کے علاوہ شہر کے بعض عربی طلبہ بھی کبھی کبھی آکر پڑھتے تھے، اس زمانہ میں علیگڈہ میں مولنا مفتی لطف اللہ صاحب کی درسگاہ عربی طلبہ کا مرجع عام بنی ہوئی تھی، اُن سے جو لوگ پڑھنے آتے تھے اُن میں سے جس کو ادب کا شوق ہوتا وہ مولانا سے پڑھنے آتا تھا، مولانا ماجد علی صاحب جنھوں نے بعد کو بحیثیت مدرس کے شہرت حاصل کی، وہ مولنا کے ادب میں اسی زمانہ کے شاگرد ہوں گے، مکاتیب میں اتنا ہی ہے، کہ "مولوی ماجد علی میرے شاگرد ہیں، ادب مجھ سے پڑھے ہیں۔" (شروانی ۹)

قیام مولانا جنوری بھر ڈپٹی محمد کریم صاحب کے یہاں مہمان رہے، یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شہر میں پانچ روپیہ ماہوار کا ایک مکان لے کر اس میں اٹھ گئے، مولانا کے منجھلے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم اور ان کے چچازاد بھائی محمد عثمان صاحب اور ایک اور عزیز عبد الغفور صاحب تعلیم کی غرض سے اُن کے ساتھ گئے تھے، چنانچہ یہ مختصر قافلہ اسی مکان میں جاکر مقیم ہوا،

لیکن اس مکان سے کالج دور تھا، اس لئے آنے جانے کے لئے سواری کا انتظام کیا، مولنا اس مکان میں کئی مہینے رہے، اس مکان کے قریب خواجہ محمد یوسف[1] صاحب وکیل علی گڈہ

---

[1] خواجہ محمد یوسف نے متوسطات تک عربی تعلیم پائی تھی، مولنا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، نیز مولوی سمیع اللہ خاں کے قانون میں ان کا تفوق مسلم تھا، خصوصاً قوت جرح میں، سرسید کے ہواخواہ و معاون تھے، اختلاف کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کا ساتھ دیا، (حبیب الرحمن)

(والد خواجہ عبد المجید صاحب بیرسٹر) کا مکان بھی تھا، ۲۰ راپریل ۱۸۷۳ع کو اپنے عزیز شاگرد محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا جو مکاتیب میں شامل ہے، اس خط سے اس مکان کی وضع، رہنے سہنے کا انداز اور اس زمانہ کے احباب اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے،

علی گڈہ کے ابتدائی مشاغل اور احباب

عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمھیں ہو یا نہ ہو مگر میں تمھاری طرف سے فرض کر کے اپنے طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان وشوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دوگے اور سادے فقروں پر قناعت کروگے، میں جس مکان میں رہتا ہوں شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکھن کی طرف ایک خوشنما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے، اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے، صدر مقام کے دائیں جانب ترکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبد الغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے، اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے،

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے، اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے

شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اُردو ہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں، اور قیس تخلص کرتے ہیں،

خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے،

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں، اور بفضلہٖ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی، مدرسہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں،

افسوس کہ میرے قصیدہ کی متعدد کاپیاں نہیں، ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کہ مل دل کر پرزے پرزے ہو گیا، اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کر لیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا،

مرثیہ[۱] (جو تم بھی دیکھ چکے ہوگے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے ازبس پسند فرمائی ہے، میر اکبر حسین[۲] صاحب بھی ان میں داخل ہیں،

یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحبِ دیوان ہیں، اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں، اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے فخریہ کتابیں بھیجدیا کرتے ہیں۔"

---

[۱] سالار جنگ اوّل کا مرثیہ مراد ہے، جو دیوان میں شامل نہ ہوا، مگر علی گڈہ گزٹ میں چھپا ہے،

[۲] مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی مراد ہیں، وہ اس زمانہ میں علی گڈہ میں منصف تھے،

سر سید سے میل جول | مولنا چونکہ کالج کے احاطہ سے باہر رہتے تھے اس لئے دونوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع کم ملتا تھا، مگر جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے ایک دوسرے کی قدر پہچاننے لگے. مولانا کو سر سید کے کتب خانہ کی محبت تھی اور سر سید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں اُن کو مدد دے سکے، سر سید کے بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کا نشان اب بھی باقی ہے، سر سید نے مولانا کو اس میں جگہ دی، اور وہ شہر سے اٹھ کر اس بنگلہ میں چلے آئے، یہاں آجانے کے بعد دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہو گئی، اگر مولانا کسی دن نہ جا سکتے تو آدمی بھیجکر بلواتے، اور مختلف علمی اور قومی مذاکرے درمیان ہوتے،

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید صاحب بو علی سینا کی اشارات جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے دیکھ رہے تھے، کوئی الجھاؤ ایسا تھا جس کو وہ حل نہیں کر سکتے تھے، اتنے میں وہ جا پڑے سید صاحب نے کہا خوب آئے. یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا، مولانا فرماتے تھے کہ بلا قصد میری زبان سے نکل گیا کہ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، کہنے کو تو کہدیا مگر بیحد شرمندگی ہوئی، سید صاحب چپ رہے. مولانا نے کتاب کا مطلب سمجھایا تو اُن کے چہرہ پر بشاشت آئی،

مولوی عبد الحلیم صاحب شرر جو مولانا کے پرانے دوست تھے، اور اُس زمانہ میں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، مولانا شبلی کے پاس علیگڈہ جا کر کبھی کبھی مہمان ہوتے تھے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

"علی گڈہ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے

سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا، ان میں جستجو وتحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولٹنا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی؛

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی وکلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے، اور تحقیق وتدقیق کے لئے انھیں اکثر حدیث وفقہ اور تاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا، اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش وجستجو اور جلبِ روایات کے معتقد ومعترف ہو گئے تھے، اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سیّد صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا، مولٹنا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بےتکلّفی تھی، اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں، سیّد صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے، اور مولٹنا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم

جو ان دنوں شائع ہوئی تھی، "صبحِ اُمید" ہے، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پرلطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے، اور اُسی زمانہ میں علی گڈھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی"۔

علی گڈہ میں ابتدائی مشاغل

تعلیم و تدریس کے علاوہ علی گڈہ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعر و شاعری تک محدود معلوم ہوتے ہیں، ان ہی لوگوں سے اُن کو دلچسپی تھی، جن کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، فارسی نامے اب بھی لکھے جاتے تھے، مگر اب قلم نے اردو خط کا بھی آغاز کر دیا، فارسی میں غزل اور قصیدے اور اردو میں صرف غزل لکھتے تھے، ۲۰ اپریل ۱۸۸۳ء کے مذکورۂ بالا خط سے اُن کا شاعرانہ ذوق بالکل نمایاں ہے، اردو غزلیں بھی لکھ لکھ کر وطن کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیجتے، مکاتیب جلد اوّل میں محمد سمیع صاحب کے خطوط میں کئی اردو غزلیں نظر آئیں گی، ان غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۰ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط ۵ میں لکھتے ہیں:- "آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزون کر لیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی، دو تین شعر مزے کے ہیں، تمھیں بھیجتا ہوں"۔ پھر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط ۶ میں اپنی دو اردو غزلیں محمد سمیع صاحب کو اور ایک فارسی مولوی حمید الدین صاحب کو بھیجتے ہیں، ۸ فروری ۱۸۸۴ء کو پھر ایک اردو غزل محمد سمیع صاحب کو ان کے خط ۸ میں سنائی جا رہی ہے، اسی تاریخ کے خط میں ایک قصیدہ عیدیہ کے لکھے جانے کی بشارت ہے، جو ۱۸۸۳ء میں لکھا جا چکا تھا اور گزٹ میں چھپا تھا، اور دیوان

مین بھی شامل ہے، اسی خط میں اپنے فارسی دیوان کے مرتب کیے جانے کے خیال کا بھی اظہار ہے،
۲۷ مارچ ۱۸۸۳ء کو یہ خیال اتنا غالب ہوتا ہے کہ اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے
درخواست کرتے ہیں کہ اُن کے فارسی کلام کو دیکھ لیں کیونکہ وہ چھاپا جائے گا، اسی تاریخ
کے خط میں ایک فارسی واسوخت اور ایک اردو نامہ لکھے جانے کی خبر دی ہے، فرماتے
ہیں: "قابل دید ہیں، خود اپنی زبان سے سناؤں گا" (سمیع ۱۰) ۲۴- اپریل ۱۸۸۴ء کے خط
(سمیع ۱۲) میں فرماتے ہیں: "واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں، یعنی ۹۰ شعر، اور اسی قدر نامۂ اردو
کے، حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا، میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سرد ست
چھپ جاتا، مگر روپیہ نہیں۔"

کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شُہرہ

اب کالج مولانا کے شعر و سخن کے چرچوں سے چھکنے لگا، انھی دنوں اپریل ۱۸۸۴ء میں "حیراں و فراواں" کے قافیہ اور "چہ کنم" کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، لڑکوں میں چرچا ہوا، کچھ نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے کیا حاصل؟ آخر اس زمانہ کے دو مشہور فارسی شاعروں خواجہ عزیز الدینؒ صاحب مصنف قیصر نامہ پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ، اور غالب کے شاگرد نیر دہلوی کو حَکَم مان کر مولانا اور حزیں دونوں کی غزلیں بحذف مقطع بھیجی گئیں، دونوں نے تسلیم کیا کہ مولوی شبلی نے جو لکھا وہ اہلِ زبان کا کلام ہے، حضرت نیر نے تو بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے،
(مکاتیب اوّل سمیع ۱۲)

لے خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے، لکھنؤ میں اس زمانہ میں اُنکی فارسی دانی کی دھوم تھی، اُن کا فارسی کلیات چھپ گیا ہے

مولانا کی یہ غزل دیوان میں نہیں صرف دو شعر ہیں،

خود گرفتم کہ بہ زلفش نفروشم دل ودیں ۔۔۔ در بغارت بردآں نرگسِ فتاں چہ کنم

چاکے از دستِ جنوں بہرۂ من باشد گو ۔۔۔ از مغانش نفرستم بہ گریباں چہ کنم

لیکن مولانا کے ایک پرانے شاگرد کے ذریعہ سے ہم کو یہ پوری غزل مل گئی ہو، مطلع یہ ہی:-

گر کم عقل نہ گیرم منِ حیراں چہ کنم ۔۔۔ می دہد ہنچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

یہ پوری غزل دوسرے موقع پہ ہدیۂ ناظرین ہوگی،

اسی واقعہ کا یا اسی قسم کے دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے اُس تبصرہ میں کیا ہے جو انھوں نے مولانا کے مجموعۂ نظمِ فارسی کے پہلے اڈیشن پر لکھا تھا، اور جو ۸۔ ستمبر ۱۸۹۳ء کے علی گڈھ گزٹ میں چھپا تھا، وہ لکھتے ہیں :- "مجھے ایک دفعہ کا ذکر خوب یاد ہے کہ انھوں نے (مولانا شبلی نے) اپنی غزل کے اور شیخ علی حزیں کی غزل کے اشعار ملا کر لکھے اور قدر شناسانِ سخن ذوالقدر خاں بہادر خواجہ غلام غوث صاحب[1] اور جناب نواب ضیاء الدین خاں فردوس مکاں کے پاس اس درخواست سے بھیجے کہ جو اشعار اس غزل میں آپ کو زیادہ پسند آئیں، اور اچھے معلوم ہوں ان پر صاد لکھ کر میرے پاس عنایت فرمائیے، ان مبصرانِ سخن نے مولوی صاحب کی استدعا کے موافق غزل کے اشعار پر صاد لکھ کر کے واپس بھیجدیا تو زیادہ تر صاد مولوی صاحب ہی کی غزل پر تھے۔" اس حوصلہ افزائی کا غالبًا یہ اثر ہوا کہ مولانا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) اُن سے آگے چل کر مولانا کے عزیزانہ و بزرگانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے، مولانا لکھنؤ جاتے، اُن سے ملتے، بلکہ ان کے پاس ہی ٹھہرتے، اخیر اخیر زمانہ میں غالبًا ۱۹۰۵ء میں ایک دفعہ خاکسار بھی مولانا کی ہمراہی میں خواجہ صاحب کے یہاں گیا تھا، بڑے اہتمام سے انھوں نے کشمیری چائے پلائی تھی، ۸۰ برس کی عمر پاکر ۱۹۱۵ء میں وفات پائی،

نے حزیں کی تتبع میں اور بھی غزلیں لکھیں، (سمیع ۱۲)

مولانا کی ان شاعرانہ جولانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا کوئی جلسہ ہوتا اُس کے پروگرام میں مولانا کی نظم ایک ضروری چیز ہو گئی، جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی،

نیا رنگ اب مولانا ایسی آب و ہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علیحدہ کرنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی، بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی،

جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ اب تک جدید تعلیم کے محاسن و معائب کی خبریں مولانا دور سے سنتے تھے، اور اب اُن کو اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جانے کے چند ہی مہینوں کے بعد اپنے وطن میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔ "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمایش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھکو بی اے کی نسبت (اس زمانہ میں بی اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی[1] اس بیباکانہ اظہار و بیان سے معلوم ہو گا کہ نئی تعلیم کی ظاہری

[1] مکاتیب

چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

علی گڑھ کے اثرات: موضوعِ شعر میں تغیر

بہرحال علیگڈھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کرلیا، ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن و عشق کی جھوٹی کہانیوں سے بریز ہوتے تھے، اب قوم و ملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے، مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے؟ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا، اسی سال ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسو رلا گئی، ایک قصیدہ عیدیہ لکھا، جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دوگانہ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں ان کے چند قطرے یہ ہیں:-

حیف کیں شور و طرب یک دو نفس بیش نماند	چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمعِ اسلام چو باشد ہدفِ تیرِ بلا	خود چو چرخ کج باخت بہ ایشاں فلکِ عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید	آہ از فتنہ گری ہائے سپہرِ کج باز
خود ہماں جمع کہ می داشت ہم تیغ و قلم	خود ہماں قوم کہ بودہ است بہر پایہ فراز
اینک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن	خود بہ بیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز
شرحِ ایں حادثہ از شبلیِ دل خستہ مخواہ	شب بود کوتہ و افسانہ درازست دراز

یہ اثر روز بروز تیز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی "صبح امید" لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پُردرد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ اُمید کے طلوع کی خوشخبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبولِ عام ہوئی،

سرسید نے ایک بار نمائش گاہ کے موقع پر علیگڈھ میں ایک قومی تماشی کا جلسہ کیا، جس میں قوم کے حالِ زار کا پُر اثر منظر دکھایا، اس میں خود سرسید اور دوسرے اکابر نے تقریریں کیں، اور نظمیں پڑھیں، مولانا نے اس میں اپنا وہ اردو مسدس پڑھا جو اسی مثنوی کے ساتھ چھپا ہے، انھوں نے اس مسدس کو اپنے پُر درد پُر سوز لہجہ میں جب پڑھا، تو سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں تفصیل آگے آتی ہے،

بہر حال اس وقت سے مولانا کی نظموں کا موضوعِ سخن بدل گیا، کالج کے یونین میں ایجوکیشنل کانفرنس میں، اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں وہ نظمیں پڑھیں کہ جب وہ پڑھی جاتی تھیں تو صدر سے لے کر پائیں تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا تھا، ان کی یہ نظمیں دیوان میں موجود ہیں، اور ہر شخص آج بھی ان کو پڑھ کر ان کی تاثیر کا امتحان کرسکتا ہے،

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس

علی گڈہ تحریک کا دوسرا اثر اُن پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر آشکار ہوگئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انھوں نے خود شروع کیا، اُنکے مکاتیب میں ان کے عزیزوں کے نام کے خطوط انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اُس کے حصول کی تاکید سے بھرے ہوے ہیں، علی گڈہ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کریں، چنانچہ ۲۰- جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڈہ میں قائم کیا، خود سکریٹری ہوئے اور عزیزوں کو ممبر بنایا، اُن کے والد بزرگوار اور دوسرے عزیزوں اور ہمدردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی، اس کی عمارت اور تعمیر کے لئے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی، اعزہ اور برادری کے لوگوں سے چندے لئے، اور صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں

سے کام شروع ہوا، رفتہ رفتہ مدرسہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۶ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہو گیا، مولانا کے مکاتیب میں اُن کے عزیزوں کے نام کے خطوط میں اس اسکول کا جس کثرت سے ذکر ہے، اور اس کی طرف اپنے عزیزوں کو جس شدت کے ساتھ ملتفت کیا ہے اس سے اُن کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جو ان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کیساتھ پیدا ہو گیا تھا'

برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لئے "موازنۂ ترقیِ قومی" کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی، جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنۂ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے،

ایک دوسرا اسکول اپنے گاؤں بِندَوَل میں قائم کیا، جو غالباً ابتدائی تھا اور آگے نہ بڑھ سکا، (دیمبح ۱) شہر پٹنہ میں سرسید کے رفقا میں سے قاضی رضا حسین صاحب اور دوسرے اعیانِ شہر کی کوشش سے "اینگلو عربک اسکول" قائم ہوا تھا، جو اب تک قائم ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کا خاص مدرسہ ہونا، اور اس میں آٹھ لڑکوں میں سے پانچ مسلمان لڑکوں کا انٹرنس پاس کرنا ایسا واقعہ تھا جس پر خوشی کی جاتی تھی، چنانچہ ۸۔ مئی ۱۸۸۶ء کو مولانا فخر و مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع اپنے عزیزوں کو بھیجتے ہیں :۔ "ابکی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے جن میں پانچ مسلمان ہیں" (دیمبح - ۲۲) مولانا کو انگریزی کی ضرورت کا احساس اتنا ہو گیا تھا کہ علماء کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، اس احساسِ ضرورت کا ایک دلچسپ واقعہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا، علما کے لئے انگریزی دانی کی ضرورت کے سلسلہ میں فرمایا، "جب میں ٹرکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو

۱۲۔ بجے تار آیا، میں نے اس کو کھولا، دل میں دبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیسا تار ہے، خیر میں دوڑا ہوا سرسید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا، انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے، وہ آپ کو ٹرکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارکباد دیتے ہیں، یہ حال ہم مولویوں کا ہے؟ اسی لئے وہ ندوہ کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر بجد تھے، چنانچہ دارالعلوم ندوہ کے نصاب میں اس کے داخل کئے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی (شروانی ۲۱ و ۲۲) مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر ان ہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی، غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی، فرمایا، عجیب بات کہتے ہو اگر آج ہمارے فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے، اصل یہ ہے کہ مولانا کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے، اس لئے من نہ کردم شما حذر بکنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علما، ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجا لا سکیں،

تاریخی ذوق اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا، لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکایک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے، مولانا کی طبیعت میں اس ذوق کا بیج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر لائیٹنر (G.W.LAITNER) کی کتاب سنین اسلام کے مطالعہ سے پڑا، ڈاکٹر لائیٹنر عربی و فارسی کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے، انھوں نے عربی کے طالبعلموں کے لئے ۱۸۷۶ء

میں سنین اسلام کے نام سے اُردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی، اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولنا فیض الحسن صاحب سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج اور مولوی غلام مصطفےٰ صاحب نے مدد دی تھی، اور اس کی اردو زبان کے درست کرنے کا کام مولنا محمد حسین آزاد نے انجام دیا تھا، غالبًا تاریخ کی یہی پہلی کتاب تھی جو عربی خواں طالبعلوں کے ہاتھوں میں آئی، اور غالبًا مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہورہی کے زمانۂ قیام میں ہاتھ آئی ہیں نے سنا ہے کہ مولنا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات کے واقعات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا جب علی گڈھ پہنچے تو اس کتاب کی یاد اُن کو پھر آئی، اُس کا نسخہ مولانا سے ان کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب نے لے لیا تھا، ۲۷۔مارچ ۱۸۸۴ء کو وہ اپنا نسخہ ان سے منگواتے ہیں (ضمیمہ ۱۰ و ۱۱) اس سے پہلے ۲۶ جنوری کو مولنا محمد حسین صاحب آزاد کو خط لکھواتے ہیں کہ کتاب کا ایک نسخہ الہ آباد ایک صاحب کے پاس بھیجدیا جائے، (ضمیمہ ۔۶) اس سے ایک سال پہلے ۱۸۸۳ء میں مولانا نے جو فارسی عیدیہ قصیدہ لکھا تھا، اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں،

اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعہ سے تھے، جب وہ علی گڈھ پہنچے اور سر سید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ وجغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصروشام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا،

تصنیفی ذوق مولنا میں تصنیفی ذوق تو پہلے سے موجود تھا، اُن کی پہلی عربی تالیف اسکات المعتدی اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے مناظرانہ رسالے چھپ چکے تھے، یہاں اگر اُن کے تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا، مولانا مجھ سے فرماتے بھی تھے، اور مکاتیب میں اڈیٹر زمانہ کے ایک استفسار نامہ کے جواب میں بھی لکھتے ہیں:۔ "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں، اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا" یہ یکجا کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا، فرماتے تھے کہ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا، کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی، اس حکایت کی تصدیق مکاتیب سے بھی ہوتی ہے، ۱۹۔ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں:۔" سید صاحب نے اپنے کتبخانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں" (مکاتیب۔ ۳) یورپ والوں کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط کا نمونہ مولانا کے سامنے گبن کے رومن امپائر کا اردو ترجمہ ہے، جس کو سرسید نے اپنے لئے کرایا تھا، ایک خط میں ۱۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں "گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے[1]" (مکاتیب۔۳) اس کے بعد دوسری کتاب جو ان کے ہاتھ میں آئی وہ مشہور عربی داں انگریز مسٹر پامر کی

---

[1] تاریخ گبن کے ترجمہ کا یہ مسودہ کالج کی لائبریری میں تھا، جو سرسید کے بعد چوری گیا، اور آخر مولنا حالی کو

حیاتِ ہارون الرشید ہی، اس کا ترجمہ مولانا کے زیر نظر تھا جس کی شہادت مولوی عبدالرزاق صاحب مصنفِ البرامکہ نے جو ان کے معاصر ہیں دی ہے، مولٰنا نے المامون میں گبن کا کئی مقامات پر اور پامر صاحب کا ایک دو جگہ ذکر کیا ہے،

تصنیف کی تیاری ان کتابوں کے مطالعہ سے مولٰنا کو پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ کا خیال آیا اور پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی العباس تک محدود ہو گیا، اور غالبًا اس کے لئے اُن کے سامنے سنین اسلام کا نقشہ تھا، چنانچہ اس دوران میں انھوں نے وطن سے سنینِ اسلام کا نسخہ منگوایا (ضمیمہ ۱-۱۰) اور اسی سال ۱۸۸۳ء میں تاریخ بنی العباس کا کام بڑی محنت سے شروع کیا، (ضمیمہ ۱) اور ۹ اپریل ۱۸۸۴ء کو خلیفہ معتصم کے حالات تک وہ پہنچ چکے تھے، (ضمیمہ ۱۱) لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، اور اس کو نامورِ فرمانروایانِ اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) اس کا پتہ لگا، مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے وہ نسخہ لاکر مولانا حالی کے حوالہ کیا، مولٰنا حالی ایک خط میں مولٰنا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں: "۴۰۰ صفحہ کی ایک ضخیم جلد ہے خفی قلم سے لکھی ہوئی جس کے ترجمہ کی اجرت میں سید صاحب نے مولوی ابوالحسن صاحب کو جو حیدرآباد میں نوکر ہیں، ایک ہزار روپیہ دیا تھا، کالج کی مہریں جابجا لگی ہیں، مگر چوہوں نے بعض کو جو حاشیہ پر تھیں کتر کر وہاں اور کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، اور اکثر جگہ پہلے مہر کی سرخی کو سیاہ قلم سے کاٹا ہے، اور پھر کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، مگر ہر ایک چپّی چغلی کھاتی ہے اس کے سوا اس مسودہ کے بہت سے آدمی پہچاننے والے موجود ہیں، بہرحال یہ مسودہ میرے قبضہ میں آگیا ہے، کہئے تو محسن الملک کے پاس بھیجدوں اور کہئے آپکے یا مزمل اللہ خاں صاحب کے پاس روانہ کردوں، مگر مجھ کو آپ کی نگہداشت پر زیادہ اطمینان ہے، اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں، (مکتوبات حالی ص ۱۳ جلد اول)

مثنوی صبحِ امید

بہرحال ۱۸۸۵ء تک کا زمانہ انھوں نے کامل مطالعہ اور تصنیف کی تیاری میں گذارا، اس وقت تک اُن کی جو چیز منظرِ عام پر آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے، ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبحِ امید چھپ کر شائع ہوئی، جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا افسانہ اور علی گڈھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آیند مرقع ہے، جس کو صبحِ امید سے انھوں نے تعبیر کیا تھا، مولنٰنا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے،

یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی

کالج پہلا مقام تھا، جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یکجا تھے اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے، مولنٰنا کو کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لئے سب سے پہلا مسالہ تو سرسید کے کتب خانہ سے اُن کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ اور مولنٰنا شبلی کے تعلقات کی دلچسپ داستان ایک "شاہد عینی" کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولنٰنا شروانی لکھتے ہیں:۔ "بڑی خوش قسمتی علامۂ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست اُستاد کالج میں تھا، یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں، علامۂ شبلی کی صداقت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب

نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے اُنکو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ اُنکو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، نمائشی چیزوں کو رد کر دیا، پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا، اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا، علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی، علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے" کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولنا شبلی ایسے گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بیگانگی دور ہو گئی تھی، پروفیسر ممدوح روزانہ ان کو فرنچ پڑھانے، ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے، اور وہ خود مولنا سے عربی پڑھتے تھے، اس سلسلہ میں تعلیم کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات اور معلومات سے بھی روزانہ واقف ہوتے تھے، مولنا اپنی مجلس میں پروفیسر صاحب کے بہت سے واقعے سنایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کا جو وقت انھوں نے مقرر کیا تھا، اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا، ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہو گئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی، اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے، فرماتے تھے کہ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر دیکھ کر چپکے چپکے از خود عربی صرف و نحو کے مسئلے پڑھنے شروع کئے، چند روز کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے میں عربی عبارت پڑھتا ہوں کہیں غلطی تو نہیں ہوتی، اس کے بعد عبارت پڑھی، ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہو گئی، پروفیسر صاحب کا ایک عربی خط مولانا کے پاس تھا، اور مجھے دکھایا تھا، اس کی عربی کی تعریف کرتے تھے، اس کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے، وحلیلتی تقرئک السلام

(میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے) یہ فصیح ترین عربی ہے، اس کے بجائے یہ مضمون اگر کوئی مولوی لکھتا تو شاید یہ لکھتا وزوجتی تسلم علیک،

پروفیسر آرنلڈ[1] اور مولنا کے اِن ہی تعلقات کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب جب ۱۸۹۲ء میں انگلستان جانے لگے تو مولنا بھی اُن کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لئے آمادہ ہو گئے اور آخر ان ہی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تنہا گئے، اور ان ہی کے متعلق آپنے

[1] پروفیسر آرنلڈ کالج میں دس برس رہ کر فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڈھ سے لاہور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے، وہیں انھوں نے عربی لغت میں "سواء السبیل فی معرفۃ المعرّب والدخیل" لکھی، لاہور کے قیام میں ان کے سب سے لائق شاگرد ڈاکٹر اقبال ہوئے، ڈاکٹر اقبال اور مولنا میں تعلقات کی زنجیر وہی تھے، علی گڈھ سے ان کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا جس میں مولنا شبلی مرحوم نے حسب ذیل تقریر کی تھی:۔ "یہ یورپ کی تلوار نہیں جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بگوش کر لیا ہی، بلکہ یورپین قوموں کی خوش اخلاقی ہی جس نے تمام دلوں کو تسخیر کیا ہے، اور آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خصائل کی ایک زندہ تصویر ہے"۔ مولنا نے اس زمانہ کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فرنچ پڑھا کرتے تھے، ایک واقعہ بیان فرمایا جو انھوں نے آرنلڈ صاحب کے نیک اخلاق کی شہادت میں پیش کیا یعنی آرنلڈ صاحب ہر روز صبح کے چھ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لایا کرتے تھے ایک دن چھ پر صرف ۵ منٹ زیادہ گذر گئے، اور میں دیکھتا کیا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ سرپٹ بھاگے چلے آرہے ہیں، مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ "مولوی صاحب! ہم آپ کا مجرم ہی، ہم نے آج دیر کی آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں"۔ مولوی صاحب نے بڑے افسوس سے فرمایا کہ وہ اس نظم کو تیار نہ کر سکے جو ان کا ارادہ تھا کہ آرنلڈ صاحب کی جدائی پر لکھیں گے، لیکن اس نظم کے بجائے اس وقت صرف دو اشعار پڑھے اور وہ یہ ہیں:

آرنلڈ آنکہ دریں شہر و دیار آمد و رفت — دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت

آمد آں گونہ بکالج کہ بہ گلزار نسیم — رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

لوگوں کو یہ شعر اس قدر پسند آئے کہ تین تین دفعہ پڑھوا کر سنے ۔ (کالج میگزین فروری ۱۸۹۸ء)

سفرروم کے قصیدہ میں یہ شعر لکھا ہے، ع "آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استادمرا"

آرنلڈ اور شبلی کے سلسلۂ کلام کی دو حکایتیں مولٰنا کی زبان سے سنی ہوئی مجھے اور یاد ہیں، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ کوئی یورپین فاضل علی گڈہ آکر مجھ سے ملا، اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا، اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی، دو سال کے بعد اُس نے فارسی ادب پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی، مولٰنا فرماتے تھے کہ اس کو دیکھکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) وہ لاہور سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے، مولٰنا اس زمانہ میں حیدرآباد تھے، ان کو پہنچانے حیدرآباد سے بمبئی گئے، اور کوئی تحفہ دیا (حمیدہ ۲۵) انگلستان پہنچ کر وہ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کے سرکاری مشیر ہوئے اور ۱۹۲۰ء سے آخر تک وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے،

مولٰنا کی زبان سے پروفیسر آرنلڈ کا نام میں نے اتنی دفعہ سنا تھا کہ جب مجھے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ملاقات کا شوق تھا، اتفاق یہ کہ وہ خود ملنے آئے اور مولٰنا شبلی کی نسبت سے بہت محبت سے ملے، وہ اس زمانہ میں انڈیا آفس کے مشرقی صیغہ میں ملازم تھے، ہندوستان میں سرسید اور ان کے دوستوں کے جو خیالات خلافت عثمانیہ کے بارہ میں تھے اور مولٰنا شبلی نے جو مضمون علی گڈہ میگزین میں لکھا تھا وہ ان سب سے واقف تھے، وہ بار بار آکر مجھے مولٰنا کے اس مضمون کی طرف متوجہ کرتے تھے اور میں جواب دیتا تھا کہ اس کی حیثیت تاریخی ہے، مذہبی نہیں، اُس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کے سامنے جب ہمارے وفد نے اس مسئلہ کو پیش کیا تو وزیر اعظم کی امداد و مشورہ کے لئے پروفیسر صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے ذریعہ سے مجھے انڈیا آفس کے کتب خانہ کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی،

وہ ۱۹۳۰ء میں مصر کے جامعۂ مصریہ میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ پر لکچر دینے مصر آئے تھے، یہاں سے واپس جاکر ۹ جون ۱۹۳۰ء کو اچانک انتقال کیا، (ان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے معارف اپریل ۱۹۳۱ء) ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "پریچنگ آف اسلام" کی تصنیف اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں شرکت ہی،

مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا، انھوں نے پوچھا کہ آپ اُن سے کب ملے تھے؟ فرمایا دو سال ہوئے، جواب دیا، مولانا یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے"

ایک دفعہ فرماتے تھے کہ میں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت کرتے ہیں وہ آپ لوگ نہیں کرتے، آرنلڈ صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علم ہر روز آگے کو بڑھ رہا ہے، اس لئے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لئے وہ اُس کی رسمی عزت کہاں تک کرے!"

یہ دونوں واقعے اس بات کا نمونہ ہیں کہ یورپ کے سیاسی لوگوں کو چھوڑ کر ان دنوں یورپ کے فضلا بھی اپنی قوم کی دماغی فضیلت اور ذہنی برتری کا سکہ کس طرح ایشیا والوں کے دلوں میں بٹھاتے تھے، حالانکہ آرنلڈ صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ مجسم علم تھے، اور علم کی خدمت کے سوا اُنکا کوئی اور مطمحِ نظر نہ تھا، مولانا شبلی مرحوم نے سفرنامہ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے اس کی تصدیق ہو گی، لکھتے ہیں:- "لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر تک مجھ کو سخت پریشان رکھا، ۱۰- مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے، اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے اُن سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے، بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو آگر

برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹہ کے بعد انجن درست ہوا، اور بدستور چلنے لگا" مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے حرف شناس ہو گئے تھے، اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے، آرنلڈ صاحب سے انھوں نے فرنچ سیکھنی شروع کی، کیونکہ اسلامی مباحث پر اکثر کتابیں فرنچ اور جرمن میں تھیں، اس لئے ان دو میں سے کسی ایک زبان کو جانے بغیر اسلامیات کے متعلق اہلِ یورپ کی تحقیقات اور کاوشوں سے براہِ راست واقفیت ممکن نہ تھی، مولانا، آرنلڈ صاحب سے موسیو سیدیو کی کتاب "تمدنِ اسلام" سبقاً پڑھتے تھے، اور جس نسخہ میں پڑھتے تھے وہ تبرک دار المصنفین کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے،

مولانا کو یورپین تصانیف اور مطبوعات سے جو واقفیت ہوئی اس کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا، جس کا تعلق علی گڈھ سے نہیں بلکہ حیدر آباد سے ہے، مولوی سید علی بلگرامی جو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے، اور جو یورپ کے فضلا، اور ان کی تصنیفات سے براہ راست تعلقات رکھتے تھے اور اُن کے کتب خانہ میں ان معلومات کا بڑا سرمایہ تھا، ان سے اور مولانا سے ملاقات گو ۱۸۹۱ء میں ہوئی، مگر تعارف کا آغاز المامون کی اشاعت سے ہو گیا تھا، یہ تعارف، ملاقات کا اور ملاقات تعلقات کا ذریعہ بن گئی، مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے مولانا کو یورپ کی مطبوعات کے بہت سے نسخے بھی نذر کئے تھے، جو مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں تھے اور جن کو بعد کو انھوں نے ندوہ میں وقف کر دیا، اور اس وقت وہ وہاں موجود ہیں، فہرست ابن ندیم کا نسخہ اسی زمانہ میں مولانا کو ان ہی سے ملا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے یونانی ناموں کے

صحیح تلفظ انگریزی میں اُس کتاب پر اپنے قلم سے لکھے تھے، مولانا کا مضمون "تراجم" اسی نسخہ پر مبنی ہے،

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی جب حیدرآباد سے الگ ہو کر ہردوئی میں رہنے لگے تھے تو مولانا سے ملنے لکھنؤ آئے، اسی زمانہ میں مولانا دارالعلوم ندوہ کے معتمد تھے، مدرسہ میں اُن کی تقریر کا انتظام ہوا، اُس تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا، "اگر آپ کو یورپ کی کوئی زبان علم کی خاطر سیکھنا ہے تو فرنچ یا جرمن پڑھیے، انگریزی تو بنیوں کی زبان ہے"۔

مولانا نے کتب خانۂ اسکندریہ کی تحقیق پر جو رسالہ لکھا تھا اس میں بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین کا ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی ہی نے کر کے دیا تھا، جو رسالۂ مذکور کے ساتھ انھی کے نام سے چھپا ہے،

علی گڈھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں، مولانا انکے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابلِ اعتراض باتوں کا جواب دیتے تھے،

چنانچہ مسٹر پامر نے اپنی انگریزی کتاب ہارون الرشید کی لائف میں مسلمان بادشاہوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام قائم کیا تھا، مولانا نے المامون میں ضمناً اس کا پورا جواب دیا ہے، اسی طرح پروفیسر شیلڈون ایموز (Sheldon Amos) نے جو اس زمانہ میں لندن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے اپنی کتاب "رومن سول لا" میں فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا، مولانا نے سیرۃ النعمان کے ایک حاشیہ میں اُس کا مدلل جواب لکھا ہے، ان کتابوں کا یا ان کے مفید مطلب ابواب کا ترجمہ ان کے شاگرد اُن کے لئے کر دیا کرتے تھے،

مصری مطبوعات کا سرمایہ

اسی سلسلہ میں کالج پہنچکر مصر کی نئی عربی مطبوعات اور تصنیفات سے بھی مولانا کو آگاہی ہوئی، مصر کی حالت اس لحاظ سے ہندوستان سے بہتر تھی کہ وہ ہندوستان کی طرح انگریزوں کا پورا غلام نہ تھا اور نہ وہاں کے علمی حلقہ پر انگریزی کا تسلط تھا، یورپ کی قوموں اور زبانوں میں سے مصر کو سب سے پہلے فرانسیسی سے سابقہ پڑا، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ قبضہ گو بہت جلد اٹھ گیا مگر اس کا علمی و ادبی تسلط اس سرزمین سے نہیں اٹھا، اس لئے مصر کو یورپ کی زبانوں میں سے "بنیوں کی انگریزی زبان" سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ یورپ کی ایک ایسی زبان سے واسطہ پڑا جو سرتاپا علمی تھی، اور جس میں اسلامی معلومات و تحقیقات کا بڑا سرمایہ تھا، بہرحال مولانا مرحوم کے پاس مصر و شام کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں براہ راست آتی تھیں، اور وہ خود بھی وہاں سے ہر نئی کتاب جو مطبع سے چھپ کر نکلتی تھی منگوایا کرتے تھے جدید فلسفہ، جدید ہیئت، جدید طبعیات اور عربی صرف و نحو و بلاغت پر نئی نئی طرز کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ ان کے پاس پہنچتی تھیں، اور مولنا ان کے ذریعہ سے یورپ کی جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرتے تھے، اسی طرح قدما، کی تصانیف جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں اور جو متاخرین کی کج مج اور پیچیدہ منطقیانہ طرز تعبیر کے بجاے زیادہ واضح اور صاف ہیں، مولانا ان کے پورے قدر دان تھے، وہ جہاں سے مل سکتیں اُن کو منگواتے تھے اور پڑھتے تھے، قلمی ہوتیں تو اُن کی نقلیں لیتے،

عربی اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا اور سمجھنا اُس زمانہ میں ہر مولوی کا کام نہ تھا، تمام ہندوستان میں شاید مولانا پہلے شخص تھے جنھوں نے اُن کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا، بلکہ الہلا

وغیرہ مصر کے عربی رسالوں میں ان کے مضمون بھی چھپتے تھے، ایک خط میں وہ اپنے عربی اخبار اور اپنے یہاں آنے والے رسالوں کے یہ نام لکھ کر بھیجتے ہیں :- ثمرات الفنون قسطنطنیہ، اسلام طرابلس، المؤید، المنار، الہلال، المقتطف، (ریاض حسن خاں۔١)

آگے بڑھ کر جب مولنا کے فضل وکمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انھوں نے بھی مولنا سے تعلقات پیدا کئے، اور وہ یورپ کی مطبوعات اُن کو کبھی کبھی ہدیہ بھیجتے تھے چنانچہ ڈوزی کا مشہور عربی لغت انگلستان سے مسٹر تھارٹن (Mr. Thornton) نے ۱۶- اپریل سنہ ۱۸۹۹ء میں ہدیہ بھیجا تھا اس کتاب کے پہلے صفحہ پر مولنا کی یہ یادگار تحریر ہے،

اھدیٰ الیّ ھذا الکتاب مسٹر تھارٹن (Mr. Thornton) احد کبار الانکلیز فی عاصمۃ لندن

شبلی النعمانی ۱۶ اپریل ۱۸۹۹ء، ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ

مولنا کی یہ بھی عادت تھی کہ جب انگریزی کی نئی کتابوں کے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے اُن کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمایش کرتے کہ فلاں مقام یا بحث کا خلاصہ لکھکر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئے معلومات اگر تمھاری نظر سے گذرے ہوں تو مطلع کرو، چنانچہ مکاتیب میں اُن کے خاص خاص دوستوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں ان میں یہ باتیں اکثر نظر آئیں گی،

کالج پر مولنا کے اثرات محمڈن کالج علی گڈھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے

تمدّن وتہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا، اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہی، اور کالج نے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا،

اس بزم میں گو دوسرے علما بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے وہیں رہے، لیکن مولنا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے، اور ہر علمی بحث میں اُن کا قول فیصل تھا، وہ اپنے فضل و کمال کی بنا پر بجائے اس کے کہ نئے علوم وفنون کے اہل کمال سے مرعوب اور اپنے علوم کو اُن کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت بڑھا دیا، اور اپنے قدیم علوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو اُن کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا، اور ایسے زمانہ میں جبکہ کالج میں ہر طرف سے مسلسل نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی ایک مولنا ہی کا وجود تھا جو اس بارش کے طوفان میں اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا،

کالج کوئی پرانے طرز کا عربی کا مدرسہ نہ تھا، جہاں عربی شروح وحواشی کا درس دیا جاتا، وہ سرتاپا جدید علوم وفنون کے ہوشربا مناظر کا تماشا گاہ تھا، اس فضا میں طلبہ کے اندر اپنے پرانے علوم فارسی ادب، اور عربی زبان کا ذوق پیدا کر دینا کتنا مشکل کام تھا، مگر مولنا نے کالج میں اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی، مولوی حمید الدین

صاحب، مولوی بہادر علی صاحب، مولوی داؤد بھائی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں،

مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنا دیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ "میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے" سید سجاد حیدر صاحب کہتے تھے کہ مولانا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصولِ بلاغت اور صنائع وبدائع کو بتاتے تھے، اور اُن صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے،

طلبہ میں ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسنِ عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدر الاسلام لکھا، اور وہ کالج کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوا، اور شاید اب تک ہے، اسی سلسلہ میں مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے بنگلہ پر کرتے تھے، اور تھوڑے سے آدمی مدعو ہوتے تھے، نشست کرسی اور میز پر ہوتی اور مولانا خود سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کسی پہلو پر تقریر فرماتے تھے، رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دلچسپی بڑھنے لگی تو ۳۰- اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سیرت و میلاد کا پہلا عام جلسہ نہایت شان و شوکت سے سالار منزل میں ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال میں ہونے لگا[1]

انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مولانا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا اُسکا بیان خود انہی کی زبان سے سنیے:

[1] کانفرنس گزٹ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء از مضمون خان صاحب میر ولایت حسین صاحب،

"اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے
ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب
کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر ان دنوں ہوا کا رُخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم
کی ہے، جس کو وہ بجنۃ الصّلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی اے سکریٹری ہے، اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر
ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے،
اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش
سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس
دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریکِ نماز ہوتے ہیں، اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین
زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں کبھی کبھی اسلام
پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت
وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں، اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، میں نے بھی ۵۰ ر دیئے ہیں، سید
محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاؤڑا لیں گے، اور مسجد کی نیو کھود دیں گے، لاگت کا تخمینہ ستّر ہزار روپیہ ہے
مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصّہ ہے، اور اس
جوشِ مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا، اس جوشِ مسرّت میں اور بھی لکھتا، مگر مجھ کو میرے
بھائی خصوصاً میاں اسحٰق و عثمان یاد آ گئے، اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا، جس طرح طاؤس
کا اپنے پاؤں دیکھنے سے،
ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرّۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے، حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا

سے نرالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔" (مکاتیب محمد عمر-۱)

مولانا نے کالج میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا جو کام انجام دیا اس نے کالج کے ماحول کو سرتاپا علمی رنگ میں رنگ دیا، اس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے، اور بھی دوسرے اہلِ علم کی آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا مجموعی اثر اور بھی زیادہ تھا، طلبہ میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور اُن کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، مولوی عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، اور مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو (بشرطیکہ وہ مانیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں، جن طالب علموں میں تحریر و انشا کا ذوق تھا، وہ ذوق بھی مولانا کی تحریک سے ابھر کر نمایاں ہوا، اس سلسلہ میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ صاحب وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، جن طالب علموں کو شعر و سخن کا چسکا تھا وہ مولانا کی سخن سنجیوں سے متأثر ہوئے، مولوی ظفر علی خاں، مولوی ہدایت اللہ صاحب (سی پی) اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر کی سخنوری اگر تنہا مولانا کی نہیں تو مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں کی دوگونہ تاثیروں کی رہینِ منت ہے، ان صاحبوں میں سے جنھوں نے مولانا کے اس فیضِ اثر کو تسلیم کیا ہے ایک قابلِ ذکر ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے المتخلص بہ محوی کی ہے، جو حیدرآباد دکن میں پہلے جج تھے، اور اب دارالترجمہ میں ہیں اور فارسی کے خوش مذاق شاعر ہیں، ان کا مجموعہ نظم فارسی نذرِ عقیدت کے نام سے ۱۳۵۶ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کے مقدمہ میں مولانا مرحوم کے فیضِ صحبت اور فیضِ تعلیم کا اعتراف فرمایا ہے، لکھتے ہیں:- "علی گڈھ کالج کے بی اے

کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولنا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولنا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، مولنا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک وصاف ہو گئے، اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آجتک کامیاب نہ ہو سکا" (دیباچہ د) مولنا شروانی فرماتے ہیں" مجھکو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے، تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشو و نما پذیر ہوا ہے" اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے وہ مولنا کے ترنم کی نقل اُتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے، مولانا شرر لکھتے ہیں" ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبولِ عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے، اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے پسند کیا، اور طلبہ نے اُسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبولِ عام دُھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا" مولنا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی ناموری میں بہت کام آئی ہے، جتنے اکابر اور امرا، یہاں اُس زمانہ میں آئے اُن کو درد ملت سے آشنا اور کالج کی ہمدردی اور اعانت کی طرف ملتفت کرنے میں مولنا کی شاعری نہیں، ساحری بڑا کام دیتی تھی، چنانچہ وہ اسکو کبھی غرناطہ کبھی بغداد اور کبھی صفاہاں بتاتے تھے، اور مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی امیدگاہ ٹھہراتے تھے،

آنکہ گو ہر طلبد جانب عماں گذرد ۔۔۔ بر سد بر در او ہر کہ بود طالبِ فن

گر بدیں گونہ بود گرمیٔ ہنگامۂ او　　　خود زغرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد

ہر دم ایں مدرسہ لاریب دگر می گردد　　　اندکے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد

تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود　　　بوے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود

تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد　　　تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود

ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امراء کی مدح سرائی کو عار سمجھا، لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کر کے فرمایشوں کی تعمیل کرتے تھے، مگر یہ بات اُن کو دل سے پسند نہ تھی، اس لئے یہ فرمایشی نظمیں اُن کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پا سکیں،

ابھی مولانا کالج میں گئے ہی تھے کہ چند روز کے بعد فروری ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور مدبر مدار المہام سر سالار جنگ اوّل نے انتقال کیا، سالار جنگ محسنین کالج کے قافلہ سالار تھے اس لئے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور کالج اُن کے ماتم میں ایک روز بند ہو گیا (مکاتیب فارسی ۲۵) اور اظہارِ غم کیلئے ایک خاص جلسہ ہوا، مولانا نے اس سانحہ پر فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جسکو اس موقع پر پڑھکر سنایا،

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر　　　آہ ایں چہ ماتم است کہ خون شد دل و جگر

تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر　　　ہم شرع را نماند کنوں معنیٔ دگر

سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر

شادی ز دل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر[۱]

---

[۱] اس بند کے بعد مرثیہ کے دوسرے اشعار حسب ذیل ہیں،

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار　　　کز یمنِ او نظامِ ریاست شد استوار (باقی ص ۱۵۴ پر)

یہ مرثیہ شاید اس لئے بھی کلیات میں جگہ نہ پاسکا کہ مولنا کے مخصوص انداز سے اسکا رنگ ہلکا اور مزہ پھیکا ہے لیکن بہرحال اسکو مولنا سے نسبت ہے اور اسکا علیگڈھ سے دکن تک پورا اثر ہوا تھا اسلئے یادگار کے طور پر حاشیہ میں یہ پورا مرثیہ نقل کردیا جاتا ہے، یہ بہت ابتدائی کلام ہے اس لئے صرف زبان اور شاعری کی حیثیت سے

آئین و رسم و داد ازو بود برقرار — بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است — ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است
آں کو فلک بہ درگہِ او سر نہادہ است — افسر بہ فرقِ خود ز مہ و خور نہادہ است
چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است — طرحِ جفائے تازہ ستمگر نہادہ است
تا ایں خبر بکوچہ و برزن فتادہ است — کارِ جہاں بنالہ و شیون فتادہ است
ایں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر — آئینہ دار طلعتِ او بود ماہ و مہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داوریش بہر — شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبشِ سپہر
در تنگ نائے تیرہ مغاک آرمیدہ است — خورشید زیر پردۂ خاک آرمیدہ است
امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود — پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود
زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود — با آسماں بجاہ برابر جز او کہ بود
اکنوں اگر کنارہ ازیں خاکداں گرفت — آوازہ اش محیط زمین و زماں گرفت
آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہِ او — آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہِ او
اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او — رحم است بر رعایا و روز سیاہِ او
مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشتست — دردے بود کہ ہیچ مداوا نہ داشتست
آں داور جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود — پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود
فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود — تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود
خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست — بار غم است اینکہ فلک را کمر شکست
از رفتنش اگرچہ جہانے بجاں بود — اما ہر انچہ خواستۂ آسماں بود
باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود — اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود
کو را بود بہ رحمتِ پروردگار جائے — خود زیر سایۂ حرم کردگار جائے

اس کو پڑھا جائے،

مارچ ۱۸۸۶ء میں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کالج میں آئے تو مولانا نے کھانے کے بعد سید محمود کی فرمائش سے فارسی کے چند بند پڑھے جنمیں پہلا بند یہ تھا۔

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود　　آخر ایں سستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ رہ گذار کہ بود　　ہوس سرمۂ غبار کہ بود

ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردۂ دیدہ، فرش راہ کہ ہست

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اس بند کے پڑھتے وقت عجب سماں بندھ گیا تھا، حضار مجلس حقیقت میں بیتاب ہوگئے، سید محمود اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے تھے، وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ "افسوس ہو کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا"[۲]

۱۸۹۵ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامرا بہادر مدار المہام حیدر آباد دکن کی علی گڈھ میں تشریف آوری کے موقع پر سر سید کی تحریک پر ایک قصیدہ[۱] لکھا اور پڑھا، جس میں مسلمانوں کے ادبار، علی گڈھ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور امیدوں کا دلچسپ اور مؤثر بیان تھا، یہ

---

[۱] قصیدۂ خیر مقدم نواب وقار الامرا بہادر،

در جہاں چوں سخن از شوکت و از شاں گذرد　　نام دستور دکن بر سر عنواں گذرد
صدر جم مرتبہ، نوّاب وقار الامرا　　آنکہ گردوں بدرش بندۂ فرماں گذرد
اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم　　بسر مدرسہ با ایں سر و ساماں گذرد
ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست　　خواجہ ابریست کہ بر طرف گلستاں گذرد

یہ قصیدہ بھی کلیات میں شامل نہیں، مگر مطالعہ کے قابل ہے، کالج کی تعریف میں اوپر جو شعر نقل کئے گئے وہ اسی قصیدہ کے ہیں، یہ پورا قصیدہ آپ کو حاشیہ میں ملیگا،

گذر افتادہ ہما کو کبۂ جاہش را — تشنہ بنگر کہ برو چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سرِ خاک — موکبِ خواجہ ہما نیز بہ نیساں گذرد
بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد — گر حدیث از شرف و پایۂ مہماں گذرد
داورا مدح تو اندازۂ ما نیست ولے — خوش بود گر سخن از عالمِ احساں گذرد
یادگارِ کرمِ دولتِ آصف جاہی است — بہ نظر ہرچہ دریں منزل و ایواں گذرد
میوزیم کو شرفِ نسبتِ نامش دارد — جائے آں است کہ از طارمِ کیواں گذرد
خاص و عامی ہمہ از فیضِ کفش سیراب اند — ابر ہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا! گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم — آنچہ بر ما ز سیہ کاریٔ دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگیٔ رتبۂ ما — بیش از آں بود کہ در وہم سخنداں گذرد
حالیا کار بآں بے سر و پائی بکشید — کہ بما ہر کہ رسد بر زدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما — آنچہ بر شیشہ ز افتادنِ سنداں گذرد
ہرچہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی — خود عیان است و مپرس آنکہ بہ پنہاں گذرد
گر نہ ایں مکتب و ایں مدرسہ برپا می گشت — ہم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد
ایں مسیحانہ اگر بہرِ مداوا می خواست — ہم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
برسد بر درِ او ہر کہ بود طالبِ فن — آنکہ گوہر طلبد جانبِ عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمیٔ ہنگامۂ او — خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب دگر می گردد — اندکے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود — جوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالبِ فن روئے بدو خواہد کرد — تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود
گر بدینگونہ بود مائدۂ فیض دراز — یک جہاں زلہ ربائے سرِ خواں خواہد بود

اسی طرح جب ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں نواب آسمان جاہ بہادر وزیرِ اعظم حیدرآباد دکن علی گڈھ آئے تو مولانا نے سرسید کی فرمایش سے رودکی کے مشہور قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا، خود مولٰنا نے شعر العجم جلد اوّل میں رودکی کے بیان میں ایک حاشیہ دے کر لکھا ہے:۔ "جس زمانہ میں مَیں علی گڈھ میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڈھ میں آئے، سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے اور وہ تم لکھو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسماں جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:۔

ہمچناں باشیم گرمِ گفتگو — قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شورِ مبارکباد و بس — ایں حدیثش بر زباں آید ہمی

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۶)

دوست افسانۂ شادی بزباں خواہد راند — خصم را دیدۂ حسرت نگراں خواہد بود
ہست چوں در کنفِ قیصرِ دارائے دکن — ایمن از فتنۂ و آسیبِ زماں خواہد بود
ملک و ملت ہدفِ تیرِ حوادث بودہ است — آستانش حرمِ امن و اماں خواہد بود
آرزوہاست در اندیشہ و از فضلِ خدائے — آنچہ اندیشہ نمودیم ہماں خواہد بود
گر بہ آئینِ سلف بہرہ ربائیم ز علم — رخشِ اقبال دگر در تہ راں خواہد بود
باز در راہِ طلب گرم بخیزیم ز جائے — خوابِ دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود
می تواں غلغلۂ اوج و ترقی انگیخت — تا بکے بر لبِ ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بما نیز گہے یار شود — چرخ تا چند بکامِ دگراں خواہد بود
ہاں بسنجی کہ نژادِ عرب و آلِ لوٗئے — ایں چنیں خستہ و رسوائے جہاں خواہد بود
آں چمن زار کہ پروردۂ ابرِ کرم است — ہاں میندیش کہ تاراجِ خزاں خواہد بود
بس بود اینکہ نہ داریم بسر تاج و کلاہ — بخت زیں بیش چہ در فکرِ زماں خواہد بود
باہمہ خستگی آں فطرتِ آبا باقی است — خاک گشتیم و ہنوز آں سرِ سودا باقی است

آسماں جاہ از سوئے ملکِ دکن جانبِ ہندوستاں آید ہمی

مولنا کا ذخیرۂ ادب جب تک زندہ ہے، کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندۂ روزگار ہیں، اور رہیں گے،

علاوہ ازیں مولنا کے پے بہ پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے، اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دی، اس زمانہ میں کالج ہر قسم کی علمی وادبی تحریکات کا مرکز تھا، یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں، نئی تصنیفات شائع ہوتی تھیں، اور نئے نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولنا جہاں گئے، علی گڈہ کالج کی شہرت کے دائرہ کو بڑھاتے چلے گئے، اُس زمانہ میں ریاست بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسنِ ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولنا کی ان ہی تصنیفات کا نتیجہ ہے، اسی طرح حیدر آباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامہ نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی مولنا کی یہی تصنیفات ہیں، اس کا ذکر سرسید کے ان خطوط میں ہے جو انھوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں،

مولانا نے اپنی ان تصانیف کے ذریعہ جو کالج کے زمانہ میں کیں کالج کی صرف معنوی ترقی میں مدد نہیں کی، بلکہ جہاں تک ہو سکا انھوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصنیفات کالج کے نذر کر کے اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا، چنانچہ ان کی یہ فیاضی یاد رکھی جائے گی کہ کالج کے زمانہ قیام تک انھوں نے اپنی تصانیف سے ایک حبہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ اُن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین مہینوں میں ان کا پہلا اڈیشن ختم ہو جاتا تھا، ایک بار مولنا کے ایک

دوست نے ایک کلب قائم کیا اور اس کے لئے اُن سے اُن کی تصنیفات ہدیۃً مانگیں تو ان کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑا " میں اپنی تصنیف نذر نہیں کر سکتا، میری تصنیفات جو اس وقت معرضِ بیع میں ہیں، المامون والجزیہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لئے چھاپی ہیں، مجھ کو حقِ تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا وہ دے نہیں سکتا، اس وقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا نہ اس سے فائدہ اٹھایا" اس کی تصدیق خود سر سید کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۰۔ مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک بلگرامی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں:- "پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمتِ عالی میں روانہ کئے ہیں، "گذشتہ تعلیم مسلمانان" کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اس لئے وہ نہیں بھیج سکا، آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حقِ تصنیف وغیرہ کالج کے نذر کر دی ہیں، اُن کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا، اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدہ کے لئے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلاقیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمھارا دل چاہے لے لو، ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید کیں اور اپنے دوستون کو بھیجدیں " (خطوط سر سید ۱۳۸)

کالج میں عربی زبان کی ترقی، اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لئے انھوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی، اس لجنۃ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے، اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، دوسری انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم تھی، جس میں اُردو کے عام مضامین پڑھے جاتے

اور تقریریں کی جاتی تھیں، اُس میں بھی مولنا کا حصہ تھا، ان ہی دونوں انجمنوں نے مل کر شمس العلمأ کے خطاب پر مولنا کو تہنیت دینے کے لئے ۱۹-جنوری ۱۸۹۴ء کو جلسہ کیا تھا جس میں تمام اکابر شریک تھے

یہاں طلبہ کی سب سے بڑی مجلس کا نام یونین تھا، اور جواب بھی ہے، مولنا اس میں بھی حصہ لیتے اور طلبہ میں حسنِ تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے تھے، یہ وہی یونین ہے جس نے سفر روم و مصر و شام سے واپسی پر مولنا کے لئے ۶- دسمبر ۱۸۹۲ء میں بزمِ دعوت ترتیب دی تھی، اور جس میں مولنا نے یہ قصیدہ پڑھا تھا،

قاصدِ خوش خبر امروز نواساز آمد	کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلیؔ آزادہ بہ کالج برسید	یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد
کالج امروز بآں فرّو شان ست کہ بود	بزم را گرمیِ ہنگامہ ہمان ست کہ بود
یونین آنکہ بما شیوۂ گفتار آموخت	ہم بدانسان ہنر آموز بیان ست کہ بود

ایک دفعہ ۱۹- نومبر ۱۸۹۴ء میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا؟ مولنا نے اپنی ایک مدلل تقریر میں یہ ثابت کیا کہ بے شبہہ مسلمانوں کا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا، یہ تقریر ایسی مؤثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ مسٹر سید محمود نے بھی اُن سے موافقت کی، (دیمبع ۳۷)

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی، اور اس موضوع پر ایسی مدلّل اور مؤثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے اُن کی موافقت میں رائے دی،

یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھون نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی، بلکہ ایک مضمون بھی لکھا، تب جاکر کہیں اُنکی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سر سید نے اپنا یہ مضمون "ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت" کے عنوان سے ۲۰- جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا،

۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے کتب خانۂ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہی اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۹ء میں الجزیہ پر جو مضمون لکھا تھا جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سر سید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانون کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اُن کے جواب اور تصحیح کے لئے ایک مجلس بنائی جائے چنانچہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ میں سر سیّد نے اس کا اعلان کیا، اور مولانا مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلہ میں داخل کئے گئے، اور مولانا کو اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا، اُن کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی شائع کئے گئے، عربی میں خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ الجزیہ کا ترجمہ کیا، اسی سلسلہ کا مولانا کا لکھا ہوا مشہور مقالہ "حقوق الذمیین" ہے،

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا جس میں کالج کے حالات، مجلسوں کی رودادیں، انجمنوں کی تقریریں، اور اکابر کالج کے مضمون چھپتے تھے، ۱۸۹۴ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا، اس نئے انتظام میں مولانا مرحوم نے اس کے اردو حصہ کی اڈیٹری قبول فرمائی اور اس کا مقصد خود مولانا کے الفاظ میں یہ قرار پایا، "اس خیال سے اس کے منتظمون نے اس کو اور زیادہ وسعت دینی چاہی، تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بنجائے جس میں کالج کی علمی خبروں کے علاوہ مسلمانون

کے علوم و فنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پُر زور مضامین لکھے جائیں، اس غرض سے اس کے ۲۴ صفحے اردو کے لیے مخصوص کر دیئے گئے، اور اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا" مولٰنا کا خیال تھا کہ اسلامی سلطنتوں کے اہم تمدنی اور انتظامی صیغوں پر اس میں مضامین لکھے جائیں اور جب وہ معتدبہ حد تک پہنچ جائیں تو ان کو مستقل کتابوں کی صورت میں شائع کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون انھوں نے جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں "اسلامی حکومتیں اور شفاخانے" کے عنوان سے شائع کیا، اور اس کے دیباچہ میں اس مقصد کی پوری توضیح کی، یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوا اور اس میں مولانا شبلی کے علاوہ، مولٰنا حالی اور مولٰنا ذکاء اللہ صاحب وغیرہ کے مضامین ماہ بماہ چھپتے رہے، اس کے جون نمبر میں مولانا کا وہ خطبہ چھپا جو انھوں نے ۱۲- اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوۃ العلما کے دوسرے اجلاس میں "علما کے فرائض" پر دیا تھا، ۱۸۹۶ء میں "حقوق الذمیین" کا معرکۃ الآرا مضمون اسی کے اپریل اور مئی نمبر میں شائع ہوا، اس آخری نمبر میں قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز مولانا نے پیش فرمائی، اور ندوۃ العلما کے تیسرے سالانہ جلسہ کی روداد اپنے قلم سے لکھ کر شائع کی، ان کے علاوہ اس رسالہ میں "املا اور صحت زبان" اور "سرسید اور اردو لٹریچر" وغیرہ مضامین ان کے قلم سے نکلے، غالباً اس رسالہ میں مولانا کا یہ آخری مضمون تھا جو جون ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں نکلا، اسی مہینہ سرسید نے وفات پائی، اور کچھ روز کے بعد مولٰنا بھی علٰحدہ ہو گئے، ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند،

کانفرنس کی خدمت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سرسید نے ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا

چنانچہ ۱۸۹۵ء تک وہ تعلیمی کانگریس کہلاتی تھی، (خطوط سرسید بنام عماد الملک ص ۱۳۵) مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پروفیسر مارین کے مشورہ سے کانگریس کے بدلہ یہ کانفرنس بنگئی، بہر حال یہ تعلیمی مجلس مولنا کے علیگڈہ جانے کے چند سال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی، اور اسکا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷، دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگدہ میں ہوا جسمیں کل ساٹھ ستر آدمی شریک تھے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولنا کی شرکت بعض ریزولیوشنوں کی تحریک وتائید تک رہی، دوسرے اجلاس میں جو ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں ہوا، مولنا نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھ کر پڑھا جس سے مسلمانوں کی اپنی پچھلی تاریخ کا کارنامہ سُن کر آنکھیں کھل گئیں، اس اجلاس کی اخیر تاریخ میں انھوں نے اپنا قصیدۂ عیدیہ جس کو وہ ۱۸۸۳ء میں لکھ چکے تھے اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنایا، یہ قصیدہ کلیات میں شامل ہے، اس میں تشبیب کے موقع پر دوگانۂ عید کی کیفیت، نمازیوں کا ہجوم، اسلامی جوش کا سمان دکھایا ہے، پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے، مولنا نے جلسہ میں جب یہ قصیدہ پڑھا تو تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہوگئے، اسی لئے پہلی دفعہ یہ قصیدہ "گذشتہ تعلیم" کے ضمیمہ کے طور پر چھپا ہے، اسی اجلاس میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی تھی، کہ "انگریزی کے جو چھوٹے چھوٹے اسکول جا بجا قائم ہورہے ہیں یہ قوم کے لئے مضر ہیں" اس پر مخالف وموافق تقریریں ہوئیں، مولنا نے بھی گویا مخالفت ہی میں تقریر کی، اور سرسید کی تجویز بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی،

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولنا نے شرکت نہیں کی، چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڈہ میں ہوا، مولنا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا جسکا مطلع یہ ہے

چرخم می بردانیک کہ بدیں زینت و ساز   چیست کیں بزم بآئینِ دگر بست طراز

باہمہ فرہ و فرباہمہ تمکین و شکوہ   چاریں مجلسِ تعلیم نہادند آغاز

کانفرنس کے آسمان پر اس وقت مولانا حالی، مولٰنا نذیر احمد اور مولٰنا شبلی، تین آفتاب و ماہتاب جمع تھے، تینوں کا تذکرہ اس شان سے اس ترکیب بند کے دوسرے بند میں آیا ہے، اور اپنا ذکر کس خاکساری لیکن کس خوبصورتی سے کیا ہے :-

نگہ از ہر سوے حالیِ آزادہ فگن   واں نذیر احمدِ طوطیِ شکر خا بنگر

آں یکے رالبِ آں نغمہ جاں سوز ببیں   واں دگر را بکف، آں دفترِ انشا بنگر

پس ازاں پا بہ فرو د آئی و بہ پائینِ بساط   شبلیِ دل زدہ را، زمزمہ پیرا بنگر

پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا، اس کانفرنس کے متعلق اپنے ایک عزیز کو لکھا "اب کی کانفرنس میں مجمع تو بہت نہ ہوگا لیکن بڑے بڑے لائق آدمی جمع ہوں گے اور اپنا جوہرِ کمال دکھائیں گے۔" (سمیع ۲۸) اس کانفرنس میں مولٰنا شریک ہوئے اور یہ تجویز پیش کی :- "اس جلسہ کی یہ راے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کئے تھے اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے، اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل و مباحث کو بالتفصیل بحوالۂ اسناد ثابت کیا جائے" اس تجویز کو پیش کرتے وقت انھوں نے اس پر ایک مختصر سی عالمانہ تقریر کی، جو کانفرنس کی اُس سال کی روداد میں ہے، سرسید نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا: "یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت بڑی ضرورت ہے، تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر

بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون ؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے ،" جو بولے وہی گھی کو جاوے" پس مولوی شبلی ہی اسکو لکھینگے، شبلی ہی لکھیں گے، تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے، مولوی شبلی ہی لکھیں گے ۔"

اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء ہی میں آچکا تھا، چنانچہ گذشتہ تعلیم کے ایک حاشیہ پر انھوں نے لکھا تھا " اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور اُن کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا، اور شاید اسی انجمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو ۔" (ص ۱۷) مگر مولانا کو اس کا اتفاق نہیں ہوا، اور نہ اس تجویز کی تعمیل میں کوئی مستقل کتاب لکھی، البتہ بعد کو الندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ کے مختلف مسئلوں پر متعدد مضامین لکھے،

۱۸۹۲ء میں کانفرنس پہلی دفعہ دہلی میں ہو رہی تھی، مولانا نے ۲۴ ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس میں شرکت نہیں کریں گے، فرماتے ہیں :- " دسمبر میں شاید اپنے کا قصد اس لئے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکو، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس غالبًا ابکی پھیکی ہو گی، مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت کی بڑبہت سُن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالبًا چپ رہیں، اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا ۔" (اسحاق ۴۸) ۱۸۹۳ء کی کانفرنس میں مولانا نے ایک اردو ترکیب بند لکھکر پڑھا جس کے شروع کے شعر یہ ہیں،

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں
یہ اُن کی بزم ہے جو یادگارِ نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جنکو پہنچی ہے
ہزاروں کوس سے آ آکے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

مولانا نے خلافِ معمول یہ قصیدہ اردو میں لکھا، اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا، میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شبلی چونکہ فارسی میں کہتے ہیں جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں جس سے سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے ورنہ فی نفسہ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں، مولانا نے یہ سُن کر اس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں لکھا، اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے، مگر محفل پر رنگ وہی چھایا رہا، اس نظم کا مضمون بھی مولانا حالی کی نظموں سے ملتا جلتا ہے،

سرسید کی وفات کے بعد بھی مولانا کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے، سنہ ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اصرار کیا کہ امسال رامپور کی کانفرنس میں وہ شریک ہوں (اسحاق، ۷، ۱) سنہ ۱۹۰۱ء میں خیال تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کردینا چاہتی ہے، اس لئے اس سال کی کلکتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ "بی اے کی ڈگری کے لئے فارسی بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ نصابِ تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے، اس میں اصلاح و ترقی کی گنجایش ہے" مولانا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پرزور اور مدلل تقریر کی جس میں انھوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوتِ متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں، اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور

حقیقی شاعری ہی، ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران وششدر رہ گئے، انھوں نے بتایا کہ علوم وفنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں، وہ فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق، اور علم طب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں، اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار ہے، پھر انھوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خودنوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا، جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد انھوں نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا تھا، اسی سلسلہ میں مولٰنا نے "ہفت بند کاشی" کے اشعار جب اپنے خاص انداز میں پڑھے ہیں تو کانفرنس مجلسِ ماتم بن گئی، اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سراوڈبرن بھی اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولٰنا شبلی کی طرح پر تاثیر تقریر کر سکوں[1]"

۱۹۰۲ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد پڑی، اور مولٰنا اسکے پہلے سکرٹیری مقرر ہوئے

۱۹۰۴ء میں دہلی میں تاجپوشی کے موقع پر جو کانفرنس ہوئی اور جس کے صدر ہزہائی نس آغا خاں تھے، "اسلام کی بے تعصبی" پر ایک عالمانہ لکچر دیا، اس لکچر کو مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر

[1] میں نے یہ واقعہ اس کانفرنس کے ایک شریک منشی محمد صدیق صاحب مختار دیسنوی بہاری سے سنا، جو میرے ہموطن مخدوم تھے، اور سرسید کے معتقدوں اور ان کی تحریک کے پرانے حامیوں میں تھے، مولٰنا شیروانی فرماتے ہیں:- "میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا، لفٹنٹ گورنر نے خاص طور پر مولٰنا شبلی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ آئیں اور مدرسہ عالیہ کو مفید بنانے کی کوشش کریں، مولانا نے وعدہ کیا مگر اسی زمانہ میں کلکتہ میں طاعون پھیلا، اس لئے نہ جاسکے،

البشیر نے جلسہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلمبند کر لیا تھا، اور بعد کو چھاپ کر شائع کیا، لیکن چونکہ تقریر ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے اس لئے مولٰنا نے اخبار ول میں لکھا کہ یہ اُن کی بعینہ تقریر نہیں،

۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھاکہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور میرزا شجاعت علی خاں کونسل ایران کی صدارت میں ۲۲- دسمبر کو "تاریخ اسلام" پر لکچر دیا، (ریاض حسن - ۱۰)

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے رہے، اور اس کی دلچسپی کو بڑھاتے رہے، غالباً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے عہدِ نظامت میں کانفرنس سے انکی دلچسپی بہت کم ہوگئی، اور اُس کی جگہ ندوہ کے اجلاسوں نے لے لی،

نینی تال کا سفر مئی ۱۸۹۸ء

مئی ۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں سرسید نینی تال گئے تھے، یہ رمضان کا مہینہ تھا، مولٰنا بھی اُن کے ساتھ نینی تال گئے، اور سید صاحب کے ساتھ ایک کوٹھی میں ٹھہرے چونکہ کسی پہاڑی مقام کا یہ پہلا سفر تھا اس لئے ایک خط میں پہاڑی منظر کی دلچسپ کیفیتیں لکھ کر بھیجیں، موقع کے لحاظ سے مولٰنا کا یہ خط اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے،

"تمام راستہ قدرتِ الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے، اگر اس پہاڑ میں سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے،"

ان قدرتی مناظر کی دلچسپیاں ایک طرف، مگر ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک کی نظر ان ظاہرداریوں سے ہٹ کر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی، ان پہاڑوں کا کاٹنا، اُن میں راستے بنانا، کج وپیچ بلکہ پُرپیچ راستوں سے اوپر چڑھنا، اور ان پر بڑے بڑے مکانات بنانا، پانی اور روشنی کا انتظام کرنا، ان باتوں سے مولانا کا ذہن انگریزوں کی بے روک ہمت، اور پُرجوش محنت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کا اصلی جوہر ہے، اس کے علاوہ انھوں نے دوسرا نتیجہ جو نکالا وہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے "یہاں جو کچھ آرام ہے وہ یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عملداری نہیں ہونے پاتی، یہی بات جس کے لئے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کر دیئے ہیں، درحقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہئے، کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں، رمضان تو خوب گذرے گا، مجھ کو اگر دلچسپی ہے تو اسی سے" ایک دوسرے عزیز کو لکھتے ہیں:- "مجھ کو نینی تال میں کچھ دلچسپی نہیں، بس اتنا ہے کہ روزے یہاں گرمی نہیں دکھاتے" (سمیع - ٢٢)

ان پہاڑوں پر جو لوگ گئے ہیں ان کو تجربہ ہے کہ یہ پہاڑی مقامات درحقیقت انگریزوں نے اپنی بے تکلف زندگی کے لئے بنائے تھے کہ وہ کھلے بند وہاں عیش و لطف اٹھا سکیں، اس لئے ہر چیز وہاں انھوں نے اپنے مذاق کی بنائی ہے، انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی وہاں جانا شروع کیا، اور وہ انگریزوں کے لئے وہاں یار شاطر نہیں، بار بر خاطر بن گئے ہیں، اور جو ہندوستانی ان کے یار شاطر بنے وہ اپنے سے کھو گئے، اس حیثیت سے اس مقام کا جو اثر مولانا کی طبیعت پر پڑا وہ یہ تھا، "..... مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ

امید رکھنا عبث ہے کہ میں اس کو فرحت زا بھی مان لوں گا، ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں ان کا مذہب کیا پوچھنا، ع ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست۔ (مکاتیب بنام شیخ حبیب اللہ)

اس سفر کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ مولنا کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا پہلا خاکہ مولنا کے ذہن میں یہیں آیا، یہ مئی کا مہینہ تھا، اور دسمبر میں اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، یہیں سے ۱۰ مئی ۱۸۸۷ء کو مولنا نے اپنے ایک عزیز کو اس مضمون کی اطلاع دی، (دیمیع ۲۲)

قصیدۂ بہاریہ جو ۱۸۸۷ء میں مکمل ہوا بلکہ ناتمام ہی رہا، اس کا خیال بھی پہلے پہلے اسی بہارستان میں آیا تھا، اور اسی کے لئے کلیاتِ غالب کا نسخہ یہاں منگوایا تھا، تاکہ توارد نہ ہو۔

تصنیف کا آغاز

۱۸۸۷ء

۱۸۸۳ء میں مولنا نے علی گڑھ میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے لیکر اب تک وہاں ان کے جو کمالات ظاہر ہوئے تھے وہ شاعری تک محدود تھے، مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موزوں ہو تلاش کر رہے تھے، بالآخر ان کو نظر آیا کہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا ہے، اور جس کے مقابلہ میں اُن کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آتا ہے اُس کو دور کیا جائے، اس وقت یورپ کے اہلِ قلم اور مصنفین کا یہ کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا اس کو مٹانے کے لئے اسلام، سلاطینِ اسلام، اور علومِ اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ لکھ کر لوگوں میں

پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پودھ کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے، اور اُن کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ اُن کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں، چنانچہ اُن کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی، اور مسلمانوں کو خود اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی، اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھکر اُن کو چکاچوندھ لگ رہی تھی، مولٰنا نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا، اور اسی کے مقابلہ کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی،

اس سلسلہ میں مولٰنا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" ہے، ۱۸۸۷ء میں لکھی، اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اس سال لکھنؤ کے ممتاز وکیل منشی امتیاز علی صاحب (والد منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری) کی دعوت پر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے زور و شور سے لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اس لئے سر سیّد نے اپنے دائرہ کے مختلف اہلِ علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمایش کی، (سر سیّد بنام عماد الملک ص ۱۳۶) مولانا نے اُن مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا عنوان اپنے لئے پسند کیا، سر سیّد نے اس عنوان کا عام اعلان کیا، ۸ مئی ۱۸۸۷ء کے ایک خط میں مولٰنا نینی تال سے لکھتے ہیں:- "محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شائع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا، شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں اور گرانمایہ لکھوں۔" (مسیح-۲۲) یہ گرانمایہ مضمون لکھا گیا، اور ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقامِ اجلاس تھا، پڑھکر سنایا گیا، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی، یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا، اس خطبہ میں مولٰنا نے تفصیل

سے مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم اور اسلامی مدرسوں کے نام اور خصوصیات و حالات، بیان کئے تھے، یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی، اس لئے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا، بلکہ الگ رسالے کی صورت میں چھپا، اسی لئے مولانا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں:- "اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ (یعنی مولانا) تاریخی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے، جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر اُن کا لکچر تھا، جسے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا، لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو ہوا ہے، تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔" ۱۸۸۶ء میں اُردو میں نئی طرز کی پہلی سوانح عمری "حیاتِ سعدی" مولانا حالی نے لکھی اور مولانا شبلی نے پسند کی، ایک خط میں ۱۰- مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھتے ہیں:- "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔" (سمیع-۱۵)

دوسری تصنیف المامون

اس کے بعد اُردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے، جو ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولانا کی پہلی مستقل تصنیف ہے، جو اُن کے نامور فرمانروایانِ اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنی العباس کا نچوڑ کہنا چاہئے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ مولانا فرماتے تھے کہ تین مہینے میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا، اور دوبارہ چھپا،

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:- (گذشتہ تعلیم کے بعد) اسی نوعیت کی اُن کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم پسند کی گئی، اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس

قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آیندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں"۔ المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے جس کو پڑھ کر مولنا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا،

مولنا شروانی سے تعلقات

المامون اہلِ علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری، اس پر اخبارول میں بہت سے ریویو نکلے، اُن میں سے قابلِ ذکر ریویو اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا، جسکو ملک اب نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام سے جانتا ہے، مولنا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱۔ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اُس کے اڈیٹر کے پے درپے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا، مولنا شروانی لکھتے ہیں:

"علامۂ مرحوم سے میری سب سے اوّل ملاقات اندازاً ۱۸۸۸ء میں ہوئی، آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ایک ریویو تھا جس کا علامۂ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا،

خامہ گیری و حرف بنگاری ۔۔۔ رسی آنگہ بدردِ من چو من

رامپور کے سرکاری کتبخانہ اور مدرسہ عالیہ میں ۱۸۸۸ء

رامپور سے مولنا کو پرانا تعلق تھا، اُن کی طالب علمی کا زمانہ یہاں بھی گذرا تھا، اُن کے استاد مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی اب تک زندہ تھے، اور اُن سے نیازمندی کی وابستگی بھی تھی، اب اُن کے تعلق کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوئی، اس زمانہ میں نواب کلب علی خان والیِ رام پور کا انتقال ہو چکا

تھا، ان کی جگہ نواب مشتاق علی خاں مسند نشین تھے، اور ریاست کا سارا نظم و نسق جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدارالمہام کے ہاتھ میں تھا، یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس زمانہ میں سرسید کی طرح جدید انگریزی طور و طریق و تمدن کو اختیار کیا تھا، بڑی شان و شوکت، اور دبدبہ و عظمت کے آدمی تھے نجیب آباد کے خاندان کے تھے ہیرسکار اور فنونِ جنگ میں بڑا نام پیدا کیا تھا، سرکار انگریزی میں اُن کو بڑا اعتماد حاصل تھا، اور جنرل کے عہدے سے ممتاز تھے، ساری ریاست میں اُن کے قوی پنجہ اور مضبوط دست و بازو کی دھوم تھی، اور لوگ اُن کے نام سے کانپتے تھے، موصوف نے اپنے زمانہ میں جو بڑے بڑے کام کئے ان میں سے ایک مدرسہ عالیہ رامپور کی تنظیم ہے، ہمارے استاذ مولانا حفیظ اللہ[1] صاحب جو مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس کے مدرسِ اول مقرر ہوئے،

---

[1] مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں چھ ماہ کے تھے، اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندی قریب محمد آباد جائے سکونت ہے، فارسی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی، اور اس کی تکمیل چشمۂ رحمت غازی پور میں کی، عربی تعلیم بنارس جاکر شروع کی، جہاں مولوی سلامت اللہ صاحب جیراج پوری عربی کی اعلیٰ کتابیں اس وقت پڑھ رہے تھے، ایک سال کے بعد پھر وہاں سے غازیپور پہنچے، اور مولانا غلام جیلانی صاحب نامی ایک فاضل وقت سے جو مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، متوسطات تک تعلیم پائی، اس کے بعد غالباً ۱۸۷۷ء میں وہ لکھنؤ جاکر فرنگی محل میں مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور وہیں علوم کی تکمیل کی، معقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال پیدا کیا، فراغت کے بعد استاد کے حسب الحکم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرسی قبول کی، وہاں سے مولانا عبدالحیٔ صاحب کی سفارش پر وہ مدرسۂ عالیہ رامپور میں صدر مدرس ہوئے، اور مولوی عبدالحق صاحب

مولنا شبلی کے رسالہ "گذشتہ تعلیم" نے عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کر دیا تھا، اور اس بنا پر کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان، خود مولنا سے اصلاح پسند حکام نے مشورہ چاہا، چنانچہ جنرل صاحب ممدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق رائے دینے کے لئے جن علما کو تکلیف دی تھی ان میں ایک مولنا شبلی مرحوم تھے، مولنا کی دلچسپی کی بڑی چیز وہاں کا کتب خانہ بھی تھا، المامون کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف واقفیت بلکہ عشق ہے اس لئے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لئے وہی سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے

(حاشیہ صفحہ ۱۷۴) خیرآبادی سے اُن کے مناظرے رہے، زمانۂ قیام رامپور میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں علم ہیئت کی کتاب تصریح پر نواب حامد علی خاں کے ابتدائی عہد میں حاشیہ لکھا، جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، وہ دس برس کے قریب رامپور میں رہے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ دار العلوم میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۸ء تک برابر اس عہدہ پر قائم رہے، اس کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مدرس عربی ہوئے اور شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے، ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن پا کر حجاز گئے، اور فریضۂ حج ادا کیا، واپسی کے بعد لوگوں کے اصرار سے پھر دار العلوم ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی، اور کئی سال تک مفوضہ خدمت انجام دے کر ۱۹۳۰ء میں وطن واپس آئے، جہاں اب تک بحمد اللہ صحیح و سالم ہیں،

مولنا عبد الحیٔ صاحب مرحوم کی شاگردی کے باوجود آخر عمر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے ہیں، عدم تقلید کا میلان پہلے سے تھا، جو شاید اوائل عمر میں مولوی سلامت اللہ صاحب کی صحبت کا اثر ہو، غرض دس بارہ برس سے اب وہ عامل بالحدیث ہیں،

مولنا کی صحت و توانائی قابلِ رشک تھی، اور اب بھی ہے، سیر و شکار اور تفنگ اندازی کا شوق ہے جو عجب نہیں کہ جنرل عظیم الدین خاں کا فیض ہو،

۱۸۸۸ء میں مولنا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیبِ اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولنا نے تین روز رہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں الماریوں کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق، اور دوسری ضروری ہدایتیں درج فرمائیں، اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم نے فہرست کا جو نمونہ بنایا تھا، اُسکو کسی قدر اصلاح کے بعد پسند فرمایا، اور اُسی طریق پر پورے کتب خانہ کی کتابوں کی از سرِ نو ترتیب کا مشورہ دیا، کتابخانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیاتِ رند اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف دونوں ایک صف میں تھیں، مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کیساتھ مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوشخطی اور حسنِ ظاہری کی بنا پر کیا گیا تھا، اور اچھی اچھی کتابیں چھانٹ دی گئی تھیں، مولنا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی، کچھ دنوں بعد نواب مشتاق علی خاں کا انتقال ہوا، اور کونسل قائم ہوئی، اور جنرل صاحب موصوف کونسل کے صدر ہوئے، (اُس وقت نواب حامد علی خاں نابالغ تھے) تو مولنا شبلی مرحوم کی تجویزوں پر پوری طرح عمل ہوا، فن وار رجسٹر بنائے گئے، اور سنہ ۱۸۹۱ء میں کتب خانہ کے لئے ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی، اور ۳۱۔ مارچ سنہ ۱۸۹۲ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، (دیباچۂ جلد اوّل فہرست کتب خانۂ رام پور) مگر افسوس کہ جنرل صاحب موصوف اس سے ایک سال پہلے اس دنیا سے رخصت

ہو چکے تھے،[1]

کتابخانۂ رامپور کے موجودہ ناظم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہو کہ مولانا کی

[1] جنرل موصوف کی موت بلکہ شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہو، ۱۸۹۱ء کی بات ہو کہ وہ رات کو ایک تقریب سے تنہا ٹم ٹم پر واپس آرہے تھے، کہ چند آدمیوں نے ان پر طپنچہ سے ایک ساتھ فائر کیا، گولی ٹھیک نشانہ پر پڑی، اور اس پر بھی اُن میں اتنا دم خم تھا کہ چند قدم چل کر ایک دوست کے دروازے تک پہنچے اور وہیں گر کر ٹھنڈے ہوگئے، اس واقعہ کا اثر سارے ملک پر پڑا، ایک عالم اور شاعر کا دل ایسے علم دوست مصلح کے سانحہ سے کیسے متاثر نہ ہوتا، چنانچہ مولانا نے اُن کا مرثیہ لکھا جو ۲۷ - اپریل ۱۸۹۱ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں مولانا کے اس خط کے ساتھ چھپا ہے،

"جناب اڈیٹر صاحب! اگرچہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے، تاہم جو واقعہ عالم آشوب اور جانگداز ہوتا ہو وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا، اس قحط الرجال میں جنرل اعظم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئیں، اُن کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب افسوسناک حادثہ ہو، مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا، لیکن اُن کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے، اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا، اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں، اسی رنج وقلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے موزوں ہوئے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں، امید ہے کہ اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دی جائے"

مرثیہ کلیات میں شامل ہے، موقع کے لحاظ سے چند شعر یہ ہیں:-

تا کے زغمِ نہاں نہ گویم | گویند مگو چساں نہ گویم
درماتمِ خانِ اعظم الدین | جز قصۂ خوں چکاں نہ گویم
درخاک شدآں امیرذیجاہ | یا تہمتن اوفتادہ درچاہ
مہمان یکے بہ شب شد و خاست | تا باز رود بسوے بنگاہ
کم حوصلگانِ سفلۂ چند | بودند نشستہ درکمیں گاہ
کاسکہ چو درمقابل آمد | آں کج روشانِ دوں بہ ناگاہ

اکثر اصلاحی تجویزوں پر عمل کیا گیا، کتابیں زبان اور فن پر منقسم ہوئیں، متعدد مجموعے بھی از سرِ نو مرتب کیے گئے،

مولانا نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس کتب خانہ کو دیکھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا، سب سے آخری بار ۶- اپریل ۱۹۱۴ء کو اس کو ملاحظہ فرمایا، اور اپنے ہاتھ سے اس پر چند سطریں لکھیں، جنمیں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اعتراف فرمایا ہے،[1]

مولانا نے کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست کی تحریر پر جو رپورٹ لکھی ہے، وہ آج معمولی بات معلوم ہو گی، مگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے لائیے، جب مشرقی کتبخانے نئی ترتیب سے آشنا نہ تھے، اور نہ علماء کے سامنے اس کام کا کوئی نمونہ تھا، اس کتب خانہ کی اس علمی ترتیب سے جو فیض علماء اور اہلِ علم کو پہنچا، اور پہنچ رہا ہے، وہ ان ہی جنرل مرحوم کی کوشش اور مولانا کے حسنِ تجویز کا فیض ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۷)

یک بار بروکشاد دادند ‏ ‏ ‏ ‏ ششش تیرو یکے خطا نہ شد آہ
برجبہۂ صبر جبیں نیفگند ‏ ‏ ‏ ‏ باآں ہمہ زخمہاے جانکاہ
برخاک فتاد و باز برخاست ‏ ‏ ‏ ‏ پس طے بنمود پارۂ راہ
آسود دمے براہ وزاں پس ‏ ‏ ‏ ‏ افسانۂ عمر گشت کوتاہ

اے کشتۂ ظلم ہاں خبر گیر ‏ ‏ ‏ ‏ ایں نالۂ ما بگوش در گیر
برخیز وبہاں برسمِ پیشیں ‏ ‏ ‏ ‏ ہم تیغ بدست وہم سپر گیر
ترکانہ کلہ بفرق بشکن ‏ ‏ ‏ ‏ چار آئینۂ وزرہ ببر گیر
آں رونقِ رامپور باز آ ‏ ‏ ‏ ‏ آں آئینۂ راد گر بزر گیر

[1] مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی نے مولانا کی روداد اور معائنہ کی دونوں تحریریں معارف اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چھپوا دی ہیں،

لطیفہ آجکل مجھے (سنہ ۱۹۴۱ء میں) رامپور جانے کا اتفاق ہوا، تو وہاں کے بزرگوں کی زبان سے ایک دلچسپ حکایت سننے میں آئی، جس سے اُس زمانہ کا ماحول اور علماء کے حسنِ اخلاق اور سادگی مزاج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، مولٰنا کسی تقریب سے رامپور میں وارد تھے، جنرل صاحب مرحوم نے اس حسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا، اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، جس میں بعض علما بھی تشریف لائے، جلسہ میں جب مولٰنا تشریف لائے تو جنرل صاحب نے انکی آمد پر چیرز دیئے، اور ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں، علمائے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے اپنی پرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالی پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں، انھوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "مولوی شبلی کیسے ہی بددین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے، جنرل صاحب کو اُن کی یہ توہین کرنی نہیں چاہئے تھی"۔ اب جب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوے تو خود ان بزرگ نے تالیاں بجائیں، اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالی پٹیو، انھوں نے مہمان کی توہین کی ہے ان کی بھی توہین کرو، اور اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسہ سے اٹھے اور اپنی پالکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے، جنرل صاحب کو ان کی ناراضی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اسکو شاباشی دی گئی ہے، قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں، اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے، اس لئے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ سے اسکو ٹھونکتے ہیں، یہ تالی نہیں ہے"۔ اس تاویل سے اُن نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہوگئی اور جلسہ میں

واپس تشریف لے آئے،

تیسری تصنیف سیرۃ النعمان

مولانا نے اس کے بعد جیسا کہ انھوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھا ہے "الفاروق" کی طرح ڈالی، مگر بعض وجوہ کی بنا پہ اس کا کام تھوڑے دنوں کے لئے روک دیا، اور سیرۃ النعمان کی طرف توجہ کی، ۱۸۸۹ء میں اس کی بنیاد پڑی، اور اخیر سال یعنی دسمبر ۱۸۸۹ء میں اس کا پہلا حصہ ختم کر دیا[1]، اور دوسرا حصہ جو بہت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۰ء میں شروع ہوا[2]، اور اسی سال کے اخیر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں وہ بھی ختم ہوا[3]، ۱۸۹۱ء کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی، اور ۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کے نسخے اعظم گڈھ بھیجے گئے[4]، یہ کتاب[5] درحقیقت مولانا کے اُسی ذوق وشوق کی دوسری شکل ہی، جو اُن کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا، بقول مولانا کے ع شمع ہمان است لگن دیگر است، مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔" اعظم گڈہ اور دیہات واطراف میں اس کتاب کے بہت سے نسخے شائع ہونے چاہئیں، حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چند اشتہارات بھی بھیج دیئے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے واقف ہونا چاہئے"۔ (سمیع ۲۹) یہ کتاب بھی کالج کی طرف سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں:۔" سیرۃ النعمان کب کی ہو چکی، دوسری بار چھپ رہی ہی" (سمیع ۳۲)

---

[1] (سمیع ۲۵) [2] (محمد عمر ۲) [3] (سمیع ۲۸) [4] (سمیع ۲۹) [5] مصنف نے یہ کتاب جس محنت سے لکھی اُس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اثنائے مطالعہ میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے بارہ میں اساتذۂ وقت سے انھوں نے استفسارات کئے، چنانچہ انھوں نے اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب سے جو استفسار کیا تھا اس کی نقل مع جواب مولانا ارشاد حسین صاحب کے مجموعۂ فتاویٰ ارشادیہ میں نظر سے گذری ہی استاد وشاگرد دونوں کے خطوں کو تبرکاً یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان نے ملک میں مولانا کو کافی حد تک روشناس کر دیا تھا، اور لوگ اس نادر روزگار کو جو اپنی قومی تاریخ کے ان قابلِ فخر کارناموں کو منظرِ عام پہ لا رہا تھا ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) مولانا شبلی مرحوم کا خط اپنے استاد مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی کے نام اور اُن کا جواب

مخدوم و مطاع ما دامت افضالہم۔ پس از ادائے مراسم تحیت و تسلیم آنکہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جد و جہد سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری لکھ رہا ہوں، جس کے لئے میں نے بہت سی مواد تاریخی فراہم کئے، اس وقت جو جزو زیر تحریر ہے وہ اُن کے فتاوے ہیں، عقود الجمان میں ان کے چند فتاوے مذکور ہیں، لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا اس لئے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے، اصل عبارت لکھ کر شبہہ لکھتا ہوں ۱۔ قال یا ابا حنیفۃ یا ابا الخطاب ماتقول فی رجلٍ غاب عن اھلہ اعواماً ونعی الیھا فظنت امراتہ انہ میت فتزوجت ثم قدم زوجھا الاول وقد ولدت ولد افنفاہ الاول وادعاہ الثانی۔ اکل واحد منھما قذف فصار الذی انکر الولد

مجھے اس میں شبہہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا، پھر قذف کے کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے، اس پر دو سوال ہیں (۱) کیا ایسی دلالت التزامی سے قذف کا جرم قائم ہو سکتا ہے؟ (۲) وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے،

دوسرا فتویٰ یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آکر گرا، اُس نے دوسرے پر پھینک دیا، اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا، اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی، اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، اس پر یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے پھینکا یہ اُس کا اضطراری فعل تھا، اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد ترمرحمت ہو، ورنہ میرا حرج ہوگا،

حیدر آباد کا سفر ۱۸۹۱ء

سرسید نے کالج کے چندہ کے لئے حیدر آباد کا پہلا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا، جب حیدر آباد میں سرسید کے دست و بازو نواب وقار الملک انتصار جنگ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی معزز عہدوں پر مامور تھے، دوسرا سفر ۱۸۹۱ء میں اُس وقت کیا جب یہ اکابر سرکار نظام کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اس سفر میں سرسید تنہا نہ تھے، بلکہ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا جس میں ان کی تحریک کے بہت سے عمائد وارکان شریک تھے اُن میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے،

اس سفر میں مولانا شبلی کی ہمرہی اس حیثیت سے تعجب انگیز ہے کہ وہ کوئی ایسا سرکاری امتیاز یا شانِ ریاست نہیں رکھتے تھے، جس کی بنا پر وہ اس وفد کے رشتہ میں منسلک ہو سکتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد میں اس وقت دو بلگرامی بھائی ایسے تھے جو علم کے حقیقی قدردان اور شیدا تھے، یعنی مولوی سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، سرسید نے نومبر ۱۸۸۹ء میں نواب عماد الملک کو اپنی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ بھیجی تو اُس کے ساتھ مولانا کا رسالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" بھی بھیجا، اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا:- "مولوی شبلی صاحب

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ از محمد ارشاد حسین عفی عنہ، مولوی صاحب محبی و مخلصی مولوی محمد شبلی صاحب وفقہم اللہ سبحانہ لرضائہ، پس از سلامِ مسنون مطالعہ نمایند، رقیمۂ کریمہ بورود مسعود باعثِ مسرت د کاشفِ مندرجہ شد، حال کم فرصتیہائے فقیر آں مخلص را معلوم است، پس بقدر ضرورت جواب و رفعِ اشتباہ کلمۂ چند نوشتم و تفصیلِ آں بروقتِ ملاقات وحصولِ فرصت موقوف است .... الخ

یہ پورا جواب فتاویٰ ارشادیہ مطبوعہ میں مذکور ہے،

نے تاریخانہ مضمون "گذشتہ تعلیم مسلمانان" اختیار کیا، وہ رسالہ مرسل ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی۔" (خطوط سرسید بنام عماد الملک ۲ ص ۱۳۶) اس کے بعد اُن کے پاس المامون بھیجی گئی اور وہ بھی قدر و منزلت سے دیکھی گئی، ساتھ ہی الفاروق کی تالیف کا خیال بھی پیش کیا گیا، نواب عماد الملک مرحوم نے اُن کی تصنیفات کی قدر کی، المامون کے پچاس نسخے منگوائے اور ان کی مدح و توصیف فرمائی، اس سلسلہ میں سرسید نے ۲۰ رمارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ارقام فرماتے ہیں، "ان کو (مولوی شبلی صاحب کو) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے، میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں، ان خیالات خام کا جن میں غالبًا امید کامیابی نہیں ہے، پھر کسی وقت ذکر کروں گا، مگر وہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں، اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدر آباد آنے کا بھی ہے، اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدر آباد لاؤں گا تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں، اور کیسے ہیں" (ص ۱۲۸)، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ "وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔"

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کئے ہیں جو اُن کے کلیاتِ فارسی میں چھپا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڈہ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے، وہاں سے لکھنؤ اور کانپور ہو کر اس سفر کے لئے روانہ ہوئے، سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا، اس لئے راہ میں ملاقات نہیں

ہوئی، اس سو، اتفاق سے مولنا پریشان خاطر تھے، اتفاق سے ریل میں دو اور معزز مسلمان مسافر ساتھ سوار ہوے، جو مولنا کے غائبانہ مشتاق تھے، انھون نے مولنا کا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے، اور راستہ بھر خدمت کرتے رہے، مولنا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے آگے کو روانہ ہوگیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد حیدرآباد پہنچے

حیدرآباد میں سرسید اور ان کے رفقا کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانہ میں اتارے گئے، احباب نے دعوتیں کیں، جلسے ہوے، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے ابھی ابھی اختیار پایا تھا وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دوچند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا، نواب اقبال الدولہ وقارالامرا، کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید اور اُن کے رفقا نے تقریریں کیں، مولنا حالی نے اپنا اردو، اور مولنا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا، جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقارالامرا، کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدرآباد میں کی گئی ہے، مولنا فرماتے تھے کہ حیدرآباد میں قیام گاہ کی چھت پر میں چلا گیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہیں ٹہل ٹہل کر شعر کہہ رہا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی یہ کہتے ہوے سیدھے وہاں پہنچ گئے کہ میں کسی کے روکے نہیں رُک سکتا، یہ ان سے پہلی ملاقات تھی،

یہ قصیدہ جب جلسہ میں پڑھا گیا تو ایک سماں بندھ گیا تھا، اس قصیدہ کے شروع میں اس دور دراز سفر کی غرض کی تمہید، پھر مسلمانوں کی تبہ حالی کی تصویر، اور اس کے بعد علیگڈہ

کی تعلیمی تحریک کی تشریح ہے، آخر میں دربار میں پہنچنے اور باریاب ہونے کا کیسا اچھا مرقع کھینچا ہے:

پس بفرمودۂ دانش ز علی گڈھ آخر — کارواں شد سوئے اقلیمِ دکن راہ گرائے
بہ نیایش بہ درِ دولتِ سلطاں رفتیم — ہم بہ فرمانِ ادب پشت نمودیم دوتائے
از پسِ کرنش و تسلیم بہ آدابِ نیاز — عرضِ مطلب بنمودیم و ستادیم بہ پائے
شاہ از لطف اشارت بہ نشستن فرمود — امر چوں فوقِ ادب بود نشستیم بہ جائے
پس ازاں معتمدِ شاہ عماد الدولہ — کہ دبیرے ست ہنر پرور و معنی پیرائے
بہ ادب آمد و توقیعِ ہمایوں برخواند — ما ہمہ گوش بر آوازش و او نکتہ سرائے
شہ بدستور گرانمایہ فرستاد پیام — کاینک آں مبلغ پیشینہ دو چنداں فرمائے
بسکہ زیں مژدۂ جاں بخش بخود بالیدیم — غنچہ ساں در بر ما تنگ ہمی گشت قبائے
چوں بما بیش ز اندازۂ خواہش بخشید — بیش ز اندازۂ خواہش دہدش اجر خدائے
شاہ تنہا نہ کرم کرد و نوازش فرمود — کہ شدیم از ہمہ اعیانِ دکن بہرہ ربائے
آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ — بازوئے دولت و دستورِ شہ و ملک آرائے
واں وقار الامرا زبدۂ اعیانِ دکن — آں ہنر پرور و دانا دل و فرخندہ لقائے
پایۂ ما بفزودند و کرم فرمودند — شکرِ ایں منت و احساں چہ تواں کرد ادائے
شائگاں گشت قوافی و ازیں چارہ نبود — خوشتر آں ست کہ اکنوں کنم آہنگِ دعائے
یارب آں باد کہ شہ با ہمہ اعیان و وزیر — تا ابد باشد و گردوں بدرش ناصیہ سائے
بعد ازیں جملہ دعاہا کہ پذیراد خدا — خویش را گر بہ دعا یاد کنم ہست بجائے

یعنی از نسبتِ آں شاہ گرامی باشم
شہ نظام ست و بہ زیبد کہ نظامی باشم

مقطع میں حضور نظام کے لقبِ شاہی کی مناسبت سے نظام اور نظامی کی کیسی اچھی مناسبت پیدا کی ہے،

مولنا شبلی اپنی نظمیں جس دلکش انداز میں پڑھتے تھے، وہ بیحد موثر تھا، یہ قصیدہ پڑھا تو در و دیوار سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہو گئی، نواب وقار الامرا نے اپنے محل فلک نما میں مولنا حالی اور مولنا شبلی کو بلوا کر دوبارہ اُن کے قصیدے سنے، اور بیحد متاثر ہوئے، اور آخر حضور تک یہ روداد پہنچی، اور مولنا سے سنا ہو کہ خود اعلیٰ حضرت نے مولنا سے اس قصیدہ کو اپنے سامنے پڑھوا کر سننا چاہا، مگر ریاستوں میں ہر چیز سیاست اور سازش بنجاتی ہو، دراندازوں نے یہ زور لگایا کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی،

حیدرآباد سے واپسی کے وقت نواب سید علی حسن خاں مرحوم خلف نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اصرار سے چند روز یہ قافلہ بھوپال ٹھہرا، وہ کیونکر ٹھہرا، اور کیسے ٹھہرا اس کی تفصیل اس حیثیت سے خاص دلچسپی رکھتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے سر سید اور علی گڈہ تحریک کی نہایت سخت مخالفت تھی، گو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا اس سے ایک سال پہلے ۱۸۹۰ء میں انتقال ہو چکا تھا، مگر شاہجہان بیگم مرحومہ والیۂ بھوپال خود نواب صاحب مرحوم کے اثر سے سر سید کی تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں، ایسی حالت میں سر سید اور اُن کے رفقا کا یہاں ٹھہرانا سخت مشکل کام تھا،

ین نے نواب علی حسن خاں مرحوم کے عزیز خاص خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی سے جو اُن دنوں وہیں نور محل میں رہتے تھے، یہ پوری روداد اس طرح سُنی ہے،

بھوپال میں قیام اس زمانہ میں بھوپال نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے علما، وفضلا کا مرکز تھا، نواب صاحب مرحوم اور دوسرے علما، کے نزدیک سرسید کا نام لینا بھی جرم تھا اور والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ بھی اسی خیال کی تھیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادہ حسام الملک صفی الدولہ نواب سید محمد علی حسن خانصاحب کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ فطرت کی طرف سے مذاقِ سلیم لے کر آئے تھے، فارسی کے خود بھی شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدرداں بھی تھے، پہلے پہل اسی تعلق سے مولنا شبلی کا نام اُن کے کانوں تک پہنچا، اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں مولنا کی "گذشتہ تعلیم" ان کی نظر سے گذری، اور اس کے بعد المامون اُن تک پہنچی، ان کتابوں کو دیکھ کر ان کی حالت ہی عجیب ہوئی، ان کتابوں کے متعدد نسخے چپکے چپکے ڈاک سے منگوائے جاتے اور قدر دانوں میں تقسیم ہوتے، اس کے ذریعہ سے کالج کے ساتھ اُن کی دلچسپی اور ہمدردی بڑھتی گئی، اب ۱۸۹۱ء میں جب سرسید کا قافلہ بھوپال سے گذرا اور حیدرآباد سے کامیاب واپس ہوا تو نواب صاحب ممدوح نے منشی محمد امتیاز علی صاحب کے ذریعہ سے جو اُس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تھے، بیگم صاحبہ کو یہ سمجھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں، مگر چونکہ بڑے بڑے انگریز حکام سے اُن کی دوستی ہے اس لئے ریاست میں ان کا مہمان ہونا انگریز حکام کی خوشنودی کا باعث ہوگا، اس رائے کو بیگم صاحبہ نے بھی پسند فرمایا اور واپسی میں سرسید

دوران کے رفقار کو بھوپال میں سرکاری مہمان بناکر روک لیا گیا اور بیگم صاحبہ اُن سے ملنے پر راضی ہوئیں، ملاقات میں سرسید نے قوم کی بیکسی اور تباہی کی ایسی پُر درد تصویر کھینچی کہ وہ بے اختیار ہوگئیں، اور کالج کو دس ہزار روپیہ اپنی طرف سے اور دس ہزار اپنے جاگیرداروں کی طرف سے عنایت کیا، اور سرسید ہنسی خوشی علی گڈھ روانہ ہوئے،

مولنٰا شبلی مرحوم یہاں نواب علی حسن خاں صاحب کے پاس ٹھہر گئے، اس وقت اُن کے علم وفضل کے یہ نئے مناظر علماء میں اچنبھے کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، شہر کے اکثر علماء اور شعرا نے اُن سے ملاقاتیں کیں، دن دن بھر یہ صحبت اتنی طول کھینچتی کہ مولنٰا گھبرا جاتے تھے، مولانا کی اور نواب صاحب کی یہی پہلی ملاقات ہے جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدرشناسی کی اخیر حد تک پہنچ گئی تھی، اور جس کے کچھ شواہد مکاتیبِ شبلی میں نواب صاحب کے نام کے خطوط میں نظر آئیں گے،

مولانا نے جو فارسی قصیدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا تھا وہ پہلی بار اسی سفر میں اور اسی بھوپال میں صاف ہوا اور چھپا تھا،

سلسلۂ علالت کا آغاز اور سفر کشمیر کا خیال اپریل ۱۸۹۲ء

علی گڈھ کی آب وہوا مولنٰا کے مزاج کے موافق نہ تھی خصوصاً سرسید کے جس بنگلہ میں وہ رہنے لگے تھے وہ نشیب میں تھا، اور وہاں پانی مرتا تھا، اس لئے وہ جگہ ملیریائی تھی، اور مولنٰا کو ملیریا کی شکایت پیدا ہوگئی، جس کے حملے اخیر اخیر تک ہوتے رہے، اس کا پہلا حملہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا، چنانچہ یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ مولوی حمید الدین صاحب کے قلم سے لکھواتے ہیں، "تین چار مہینے سے

اکثر صحیح نہیں رہتا، آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سو چھ درجہ پر حرارت تھی، چار دن تک یکساں حالت رہی، اور نہایت سخت تکلیف رہی۔ . . . . کونین جو بہت سی کھلادی ہے تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں" (ضمیمہ-۳۱) پھر ۵-اپریل کو لکھواتے ہیں:-" بخار کے دورے ہو جاتے ہیں، آج ڈاکٹر نے بڑے سر و سامان سے بخار کے روکنے کے لئے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے" (ضمیمہ ۳۲) ناممکن ہے کہ مولانا کی نگاہ میں کشمیر کی تعریف میں عرفی کا یہ شعر نہ ہو،

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید　　گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

مولنا کو خیال ہوا کہ اس "سوختہ جانی" کی حالت میں کشمیر کا سفر کیوں نہ کیا جائے، چنانچہ ۵-اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھواتے ہیں:-" میں انشاء اللہ اگر اچھا ہو گیا تو اسی مہینہ میں کشمیر جاؤں گا، اور ڈیڑھ دو مہینہ وہاں رہوں گا، اگر تم کشمیر تک چلو، تو ضرور چلے آؤ، سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہوگا تمہارے ذمہ، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمہ، علاوہ میری ہمراہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئیگا مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے" (ضمیمہ-۳۲) ذرا کشمیر کی بدمست آب و ہوا کا قیاس کیجئے کہ صرف اس کا تخیل ایک شاعر کو کتنا بدمست بنا سکتا ہے، اس کے پانچ دن بعد ۱۰-اپریل کو ان ہی کو لکھتے ہیں،" اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاء اللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤنگا . . . . . کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی نتواں شستن از زنگی سیاہی غلط ہو جائے" یہ مزاج کی بہار بھی اس علالت میں اسی کشتِ زعفران کے

خیال کا اثر ہے، مگر بہرحال اس سفر کی فال اس سال نہ نکلی، تبدیلِ آب وہوا کی اس سے بہتر صورت نکل آئی، یعنی صحت کے بعد ہی ۱۸۹۲ء میں روم وشام کے سفر پر روانہ ہو گئے، اور کشمیر کا سفر کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھ رہا،

سفر قسطنطنیہ مئی ۱۸۹۲ء

علمی شوق کے پورا کرنے کے لئے دور دراز مقامات کا سفر کرنا، اگرچہ ہمارے اسلاف کا قدیم ترین شیوہ تھا، لیکن موجودہ علمی دور کے تنزل اور انحطاط میں یہ صرف ایک افسانہ ہی افسانہ رہ گیا تھا جو ہمارے خون کے بجائے صرف ہماری علمی صحبتوں میں گرمی پیدا کرسکتا تھا،

تنگنائے اعظم گڈھ سے نکل کر اگرچہ علی گڈھ میں مولانا کے پر پرواز کے لئے ایک وسیع فضا مل گئی تھی تاہم کتابوں سے جو عشق اُن کو پیدا ہو گیا تھا اس کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع فضا کی ضرورت تھی،

اب اُن کو علمی تشنگی بجھانے کے لئے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہیں، سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لئے وہ بیتاب تھے، اُس کے لئے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس لئے مصر وشام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے کنگھالنے کی حاجت تھی،

اس کے علاوہ ان کے دل میں گذشتہ شاہانہ اسلامی شان وشوکت کی واحد یادگار ٹرکی کے ساتھ جو عقیدت ومحبت تھی، اس نے بھی ان کو مجبور کیا کہ وہ عمر میں ایک دفعہ دیارِ محبوب کی سیر کرلیں،

اپنے سفرنامہ کے دیباچہ میں وہ خود اپنے اس ذوق وشوق کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں،

"قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا۔" انھوں نے مئی ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ کیا، اور اپنے ساتھ اپنے ایک عزیز کو بھی لے جانا چاہا، چنانچہ اُن کو ایک خط میں لکھا کہ :- "ہاں وہ ضروری امر جو اس خط لکھنے کا باعث ہے یہ ہے کہ میں انشاء اللہ مئی ۱۸۹۱ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا، اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کروں گا میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو، صَرفِ راہ سے تم کو تعلق نہیں، تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے، تم اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے مجھ کو جواب لکھو، میرا سفر ہر طرح قطعی ہو چکا ہے" (سیمع)

لیکن چند در چند اسباب سے اس سال یہ سفر ملتوی رہا، بلکہ یہ عزم ایک ضعیف سا خیال ہو کر رہ گیا، لیکن ۱۸۹۲ء میں اس سفر کی تکمیل کے چند قدرتی اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ دوبارہ اس خیال کو تحریک ہوئی، ان دنوں مولنا اکثر بیمار رہتے، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آکر تبدیلِ آب و ہوا کا ارادہ کیا، اور مکان وغیرہ کے بندوبست کے لئے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خطوط لکھے اور کشمیر کا خیال جیسا کہ گذر چکا زیادہ غالب تھا، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ آج ہی کل میں ولایت جانے والے ہیں، اب دفعۃً مولنا کو خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کی رفاقت خوش قسمتی سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے نہایت خوشی ظاہر کی، اور سفر کے ضروری کاموں میں کافی مدد دینے کا وعدہ کیا،

اس وقت جہاز کی روانگی کو کل تین چار روز باقی رہ گئے تھے، اعزّہ و احباب نے

سنا تو سخت متعجب ہوئے، اور اکثروں نے کہا کہ اس عجلت اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کونسی دانشمندی کی بات ہے؟ لیکن مولنا کا جواب صرف یہ تھا ؎

انچہ باد ابادمن کشتی درآب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی اور مولنا کو تین مہینے کی رخصت کا مزید حق حاصل تھا، اس طرح چھ مہینے کی رخصت لی، اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۶-اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڈہ سے روانہ ہوگئے، جھانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا، اور بمبئی پہنچکر حاجی رحمت اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا،

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن جہاز روانہ ہوگیا، پہلی مئی کی صبح کو نوبجے جہاز پر سوار ہوئے، بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا، اور مولنا نے چھ مہینہ کے لئے ہندوستان کو خیرباد کہا، راستہ میں مسٹر آرنلڈ نے مولنا سے عربی پڑھنی شروع کی، اس سے جو وقت بچتا وہ دریائی سفر کے سیر تماشے میں صرف ہوتا،

مناظر کی خوش آیند دلچسپی نے شاعر کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، مولنا نے سفر کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا، جو سفرنامہ اور کلیات دونوں میں موجود ہے،

۷ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا، عدن میں مولنا کو مسافروں کی دلچسپی کی ایک بڑی چیز یہ نظر آئی کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں، اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں

اور کچھ آپس مین مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے ہین اور نعلین بجاتے ہین، اُن کا بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دوانّی، چوانّی، پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہین وہ سمندر مین پھینک دیتے ہین اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس مین مزہ آتا تھا، مگر ایک دردمند دل تھا جو اس منظر کو دیکھ کر بیتاب ہو رہا تھا، یہ مولنا شبلی تھے، مورخِ اسلام کے دل کو ٹھیس لگی کہ وہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشور کشا تھے آج ان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے حریفون کے سامنے مسخرگی کر کے پیٹ پالتے ہین، یہ خیال آنا تھا کہ مولنا کی زبان سے بے اختیار "قم یا عمرؓ" کے الفاظ نکل گئے، بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عرب نہین، سمالی ہین تو تسکین ہوئی۔

۱۳- مئی کو جہاز سوئز پہنچا، خوانچہ اور پھیری والون میں سے ایک نے مولنا کو ہندوستانی سمجھ کر اُردو میں گفتگو شروع کی، مولنا کو بڑا تعجب ہوا، اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اُردو کی عالمگیری پر اُن کو اور بھی تعجب ہوا (مجھے بھی ۱۹۲۰ء مین یورپ جاتے ہوئے پورٹ سعید میں یہی اتفاق پیش آیا، جب ڈونگی پر بیٹھ کر جہاز سے ساحل پر آیا اُس کا ملاح بے تکلف اردو بولتا تھا، حالانکہ وہ یہان کبھی نہین آیا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جہاز ہر روز یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اُن ہی جہازیوں سے ملنے جلنے ہیں ان سے یہ زبان سیکھ لی)

۱۴- مئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا، جہاز سے اتر کر جب مولنا نے ساحل پر قدم رکھا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور حیرت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ یہ حرمین محترمین کے بعد پہلا موقع تھا کہ انھون نے سلطنتِ اسلام کی آبادی دیکھی، یہاں سے مسٹر آرنلڈ الگ ہوئے، وہ یورپ کو روانہ ہوئے

اور مولنا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوے، یہان سے مولنا کی دلچسپی کا نیا سامان یہ پیدا ہوا کہ مسلمان اور شامی عرب مسافرون کی صورتین جہاز مین نظر آنے لگین، اتنے دنوں مین مسلمانون کی صورت کو ترس گئے تھے،

۱۵ رمئی کو جہاز یافہ پہنچا جو شام کا ساحلی شہر ہے اور ۱۶ رمئی کو بیروت، گو وقت نہ تھا مگر ایک ایسے اہم شہر کے دیدار سے محرومی جس کو خیال کی آنکھوں سے وہ تاریخ کے صفحون پر بارہا دیکھ چکے تھے گوارا نہ ہوئی اور ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے، ۱۷- مئی کو جہاز سایپرس پہنچا جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں، قبرص وہ مقام تھا جو ایک اسلامی مورخ کی نگاہ مین دلچسپی کا بڑا سامان رکھتا تھا، مولنا اُس کے شہر لماسون مین اترے، سب سے پہلے جامع مسجد میں گئے، مسجد ہی سے متصل ایک اسلامی مکتب نظر آیا، اُس مین چلے گئے، وہان کے مدرس سے جو ایک عالم تھے ملے، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اُس نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو مولنا پر بیحد اثر ہوا، اُن کو خیال آیا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان اور کہاں بحر روم کا یہ دور دراز جزیرہ، اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی رو بن کر دوڑ گئی،

۱۸- مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ بھی ابتدائی اسلامی تاریخ کا دلچسپ موضوع ہے، اسی لئے مولنا اُس کی سیر کے بہت مشتاق تھے، لیکن اتفاق سے رات کا وقت تھا اس لئے اس کی سیر سے محروم رہ گئے، ۲۰- مئی کو صبح کے وقت ازمیر (سمرنا) پہنچے اور یہان جہاز دو روز تک مقیم رہا اور مولنا نے تفصیل کے ساتھ یہاں کی سیر کی، جمعہ کی نماز

جامع حصار میں پڑھی، مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر اُس کتب خانہ میں گئے، وہاں چند علماء، اور ترکی محکمہ تعلیم کے کچھ افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور متعہ کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، یہ لوگ فارسی سمجھتے تھے، اُن کی اجازت سے مولانا نے اس مسئلہ پر ایسی عمدہ تقریر کی کہ سب نے پسند کی،

یہاں سے ۱۲، مئی کی شام کو روانہ ہو کر ۲۳، مئی کو صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، اور قلیون اور ملاحون کی کشمکش سے رہائی حاصل ہونے کے بعد ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے آئے، اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور یہی اتفاقی ملاقات اُن کی تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی، دونوں نے ساتھ سرائے میں جا کر قیام کیا، چھ سات دن تک اس سرائے میں رہے، پھر باب عالی کے پاس ایک اچھا مکان کرایہ پر لیا، اور چند روز کے بعد دوسرا مکان لیا، اور اخیر تک اسی میں مقیم رہے،

شیخ عبدالفتاح جن سے مولٰنا نے دوستی پیدا کی تھی شام کے ایک خاندانِ مشائخ سے تھے جن کو ہندوستان سے بھی ایک طرح کا تعلق تھا حضرت خالد نقشبندی جو خالد رومی کے نام سے بھی مشہور ہیں، وہ ملک شام سے ہندوستان آ کر دہلی میں حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے تھے، اور یہاں سے نقشبندی طریقہ کی تعلیم پا کر اپنے وطن واپس تشریف لے گئے، اور ہندوستان کی اس دولت کو روم و شام مین جا کر لٹایا، اور نقشبندیہ طریقہ کو جاری کیا، شیخ عبدالفتاح کا نام سُن کر اُن کی زیارت کے لئے شامی عربون کا گروہ در گروہ آنا شروع ہوا، اور اس ذریعہ سے مولٰنا کی ملاقات بھی ان سے ہونے لگی، ان ہی آنے والوں

ہیں ایک نوجوان شامی عالم شیخ علی ظبیان تھے، ایک دن وہ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے، تو مولنا بھی پاس ہی بیٹھے تھے اور سامنے مولنا کی عربی تصنیف اسکات المعتدی رکھی تھی، شیخ علی ظبیان کی نظر اُس پر پڑی، تو کہا "آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا، اور انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا "شکر اللہ مساعیہ" شیخ علی ظبیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے مصنف یہی ہیں تو اٹھکر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مولنا کو اس بات سے کہ اُن کی ایک معمولی سی تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے نگاہِ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی، شیخ علی ظبیان سے مولانا کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے، اور وہ اس سفر میں ان کے بہت ممد و معاون ثابت ہوئے چند روز کے بعد انھوں نے مولنا سے منطق پڑھنی شروع کی، ان کے ساتھ فواد بک وغیرہ چند اور نوجوانوں نے بھی شرکت کی،

تبخانوں کی سیر

اس سفر سے مولنا کا اصلی مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا، قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت دور دور واقع تھے، مولنا ایک ایک کتبخانہ، اور ہر کتب خانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو اُن کے مقصد سے تعلق رکھتی تھی دیکھتے پھرتے تھے، اور اس غرض سے اُن کو روزانہ تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ روزانہ یہ تکلیف اٹھاتے تھے، اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کتب خانوں کی سیر کرتے رہتے تھے، چنانچہ قسطنطنیہ سے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔" (سرسید-۱)

یہاں جو کتابیں نظر سے گذریں، اُن میں سے سرسید کو ان کے فلسفیانہ مذاق کے مطابق جن تصنیفات اور مصنفوں سے باخبر کیا ہے اس کا تھوڑا سا حال سرسید کے نام کے خطوں میں ہے، ۲۲- مئی کو وہ قسطنطنیہ پہنچے اور تین ہی روز کے بعد ۲۵- مئی کو وہ اُنھیں خط لکھتے ہیں:"سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپیے بھیجدیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جاسکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں، اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات ملسکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں، . . . .

معتزلہ کی کتابیں یہاں بھی نہیں،

پھر ۱۵- جون ۱۸۹۲ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، (یعنی خریدنے کے لئے نہیں ملیں) مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتدبہ ہے، یہاں امام غزالی کی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات[1] کا نسخہ بھی ہے، بوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں . . . . . معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں" . . . .

۵- جون ۱۸۹۲ء کو اپنے والد ماجد کے نام لکھتے ہیں:- "کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہوسکتیں نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل

[1] سرسید نے مکاتباتِ امام غزالی کا جو نسخہ شائع کیا ہے، کیا وہ یہیں سے منگوایا گیا تھا،

پیادہ سفر کرتا ہوں، کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں، ماموں صاحب سے فرما دیجئے کہ آجکل یہاں عینی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے، نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات ان میں ایسی ہیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتیں، قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی، ایک مشترکہ کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایہ کی ہے جس نے عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے، اسی میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔"

سفرنامہ میں مولانا نے یہاں کے کتب خانوں کے علمی سرمایہ پر جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتبخانوں میں کیا کیا دیکھا، فرماتے ہیں :- "میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے دنیا سے ناپید ہوگئے لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے یہ بھی غنیمت ہے" اسی سلسلہ میں ابن سینا کی حکمتِ مشرقیہ کا ذکر کیا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں :- "مشہور حکماء اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں، اکثر یہاں موجود ہیں" اسی سلسلہ میں مولانا نے تاریخ و ادب کی حسب ذیل نادر کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ "اسرار البلاغۃ جرجانی، دلائل الاعجاز جرجانی، البیان والتبیین للجاحظ، تذکرۂ ابن حمدون، معجم الادباء یاقوت، کتاب الاشراف بلاذری، تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب القضاۃ وکیع، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ الاسلام ذہبی، تاریخ الحکماء قفطی، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم ابن جوزی، مرآۃ الزمان سبط ابن جوزی، مسالک الابصار ابن فضل اللہ، عقد الجمان بدر الدین عینی، تاریخ دمشق ابن عساکر، رحلۃ ابن خلدون، نہایۃ الادب نویری، طبقات کبریٰ ابن سعد،

طبقات الامم صاعد اندلسی، سیرۃ العمرین ابن جوزی، کتاب الصناعتین عسکری، شرح تبریزی بر حماسہ دیوان ابونواس مکمل، سرقات المتنبی ابن عمید، مجموعۂ رسائل ابو اسحاق صابی وغیرہ"۔

کیا زمانہ کی نیرنگی ہے، جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے یہ محنت شاقہ اٹھائی تھی وہ ان ہی کے زمانہ سے چھپ کر عام ہونے لگی تھیں، اور اب تو شاید اُن کی ان پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ چھپی ہو، ایک منتظم اور تاریخ کبیر بخاری تھی وہ بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ رہی ہے، تاہم اس سے مولانا کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر فن میں ان کی نگاہِ انتخاب اُسی پر جا کر رُکی جو انتخاب کے قابل تھی، اور وہ مولانا ہی تھے جنھوں نے ان کتابوں کے ناموں سے ہندوستان کو سب سے پہلے روشناس کیا،

الفاروق کے لئے جن کتابوں سے معلومات ان کو مل سکتے تھے، اُن کو مطالعہ کیا، اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاۃ محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں، اور مصنف نے الفاروق کے مقدمہ اور حاشیہ میں بھی اس کی تصریح کر دی ہے،

مدارس کا معائنہ

کتب خانوں کے بعد یہاں کے مدارس دیکھنے کی چیز تھے اور مولانا کو جو شوق و آرزو یہاں تک کھینچکر لائی تھی اس میں اس چیز کا مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھا، سفرنامہ میں فرماتے ہیں:۔ "اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔" چنانچہ اسی لئے اس پر بہ نسبت اور باتوں

کے زیادہ توجہ کی، اور جہاں تک ہوسکا اس کے لئے کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، وہ چند بار سررشتہ کے دفتر میں گئے تعلیم کے افسروں سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے اسکول اور کالج خود جاکر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملے، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، وہ ہندوستان کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں تھے جو مسلمانوں کی نئی امیدوں کا مرکز تھی اور خود پرانی تعلیم کے مدرسوں کی پیداوار تھے، اس لئے دونوں کے حسن و قبح سے واقف تھے، اور یہ جاننے کے لئے بیتاب تھے کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے قدیم و جدید کو کس طرح پیوند دیا گیا ہے، لیکن جب یہاں پہنچکر انھوں نے دیکھا کہ یہاں بھی قدیم و جدید کے درمیان وہی حدفاصل قائم ہے تو اُن کے دل کو چوٹ لگی، ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں:۔ افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے، اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اُس میں یورپ کا ذرا پتہ تو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں، اور جب تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے اصلی ترقی نہ ہوسکیگی، یہی کمی ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔" نئے طریقہ کے جو اسکول اور کالج تھے مولانا نے اُن کو ایک ایک کرکے دیکھا، مکتب حربیہ (ملٹری کالج) مکتب الحقوق (لا کالج) مکتب الصناعۃ (ٹکنیکل کالج) مکتب بحریہ، مکتب الزراعۃ (ایگریکلچر کالج) مکتب سلطانیہ مکتب ملکیہ (سول سروس کالج) وغیرہ میں گئے، وہاں طلبہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو غور سے دیکھا، اُن کے بورڈنگ کے انتظام اور طور طریق پر غائر نگاہ ڈالی، اور ان میں جو باتیں قابلِ ذکر تھیں ان کو سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، تاکہ وہ کالج میں رائج کی جائیں،

اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ " یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو

بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے، اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے، مجھکو یہ بات بہت پسند ہوئی، ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس وپیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے۔" مولانا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا، اور اس کے رواج دینے کی کوشش کی، اس وقت کالج میں جس یونیفارم کا رواج ہے وہ اسی تجویز کی ادھوری تعمیل ہے، حیات جاوید میں ہے:۔ "پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لئے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکا، لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے ہمچشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کر لیتے ہیں۔" (۲ صـ ۹۴)

اسی طرح مولانا سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں: "ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے، اور دولتمند ترکوں کی طرف سے اُن کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جاکر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے، اور غربا کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا، ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے، بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا، اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلافِ مراتب پر افسوس کرتا تھا۔ . . . . . میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع،

خوراک، مکان، فرنیچر کلیۃً ایک کر دیا جائے، اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹا دی جائیں اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں"۔ (سفرنامہ ۶۰) مکتب ملکیہ یعنی سول سروس کے کالج میں جب وہ گئے ہیں تو اتفاق سے ظہر کی نماز کا وقت آگیا، اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے، وہ سماں مولانا پر اثر کر گیا، لکھتے ہیں:۔" اس اثنا میں ظہر کا وقت آگیا، مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی، عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے، اور اس لباس میں اُن کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا، اور وقار و احترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے"۔ (ص۶۲) ترکی کے مصنفین اور ادبا سے بھی ملاقاتیں کیں، اور جدید ترکی ادب کا جو سرمایہ پیدا ہوا تھا اس کا بھی اندازہ لگایا، یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور علمی رسائل دیکھے، اور ان کی ظاہری شکل و صورت، چھاپہ کی خوبی، ٹائپ کی خوبصورتی، صفائی، اور مضامین کے تنوع اور بلندی سے اُن کو خوشی ہوئی، مگر یہ دیکھکر افسوس کیا کہ حکومت نے سیاسیات کے میدان کو اتنا تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ اس نمک کے بغیر وہاں کا ہر بہتر سے بہتر کھانا بھی بدمزہ ہو رہا ہے،

یہاں ہر طرف ترکی زبان کا ماحول دیکھ کر مولانا نے ترکی پڑھنی شروع کی، چنانچہ اپنے والد کو لکھتے ہیں:۔" ترکی پڑھنی میں نے شروع کر دی ہے، دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں"۔

ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے ایک عرب تھے جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے، مولانا نے ان ہی سے ترکی سیکھنی شروع کی، مولانا نے گو سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جو ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے

ان سے سیکھی تھی وہ بھی اب محفوظ نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی ترکی سیکھ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک استاد زادہ مولنا محمد امین صاحب چڑیا کوٹی خلف مولنا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی کو اس زبان میں اپنا شاگرد بنایا، اور وہ بعد کو ترکی اچھی طرح سیکھ گئے، اخیر اخیر زمانہ تک مولنا کا یہ حال تھا کہ ترکی اخبار ہم لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے، اور عربی لفظوں کے سہارے سے اُس کا کچھ حاصل نکال لیتے تھے،

یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر مولنا کو جو خوشی ہوئی اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر اُن کو تکلیف ہوئی، بلکہ یہاں تک اُن کی رائے ہوئی کہ "موجودہ (پرانی) تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصوّر میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی، (سفرنامہ ص۸۲)

قسطنطنیہ میں مولنا کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طالب علم بیس ہزار سے کم نہ تھے، مگر سب کی حالت افسوسناک تھی، اُن کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک، صحن مختصر، مکانات بند بند، ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ و خیرات، بایں ہمہ مولنا نے ان مدرسوں کو دیکھ کر ترکوں کی اس علمی فیاضی کا اعتراف کیا کہ وہ ہر چند کم حیثیت سہی، تاہم آج سینکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے، اور انصاف یہ ہو کہ یہ مدرسے جس زمانہ کی یادگار ہیں اُس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کہ بجائے خود ایک اقلیم ہے، حکومتِ اسلام کی شش صد سالہ مدت کی

ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں، (سفرنامہ صـ۵۰)

اس تفاوتِ حال کا سبب تو ظاہر ہے کہ ترکوں کی اسلامی سلطنت باقی تھی اور ہندوستان کی مٹ چکی تھی، بہر حال یہ تو دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم مدارس کی اس حالت کو دیکھ کر اُن کو بڑا درد ہوا، آج ٹرکی میں جو مذہبی و تمدنی انقلاب برپا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری کا نتیجہ ہے اور ہر قدیم کو مٹا کر ہر جدید کی طلب کا جو شوق جنون کی حد تک مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں پیدا ہوا وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدیم و جدید تعلیم کے درمیان تطبیق کی کوئی کوشش اتنے زمانہ تک وہاں نہیں کی گئی، میں نے اپنے سفر افغانستان میں افغانستان کے وزراء اور امراء کی خدمت میں یہی عرض کیا تھا، اور اسی نتیجہ سے اُن کو ڈرایا تھا،

مولانا کے دل کو ٹرکی میں جس دوسری چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ یہ ساری رونق، یہ ساری چہل پہل، یہ ساری ترقی جو کچھ بھی وہ سلطنت کے دم سے تھی، اس میں ترکی قوم کی کوشش وعمل اور جد وجہد کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ اسی طرح سُست و ساکن اور بے خبر تھی، جیسی خود ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم، یہ دیکھ کر ان کے دل پر جو اثر ہوا، اس کو سفرنامہ میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

"(سیاسی قید و بند کا) یہ بھی اثر ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے .... اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ .... تمام کالج اور اسکول جن کا میں نے ذکر کیا حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دار السلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولتمند نہیں ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جب قوم کی تمام ضرو

گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں" (ص۱۴۹)

مولنا کی دور رس نظر نے ٹرکی کی جس بیماری کا اُن دنوں احساس کیا تھا، اسی کا علاج مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی حکمت اور تدبیر سے کیا یعنی ترکی سلطنت کو ترکی شہنشاہی سے نہیں، ترکی قوم کے ذریعہ سے زندہ کرنا، البتہ اس راہ میں مصطفیٰ کمال سے جو بے اعتدالی ہوئی، اس کا افسوس ہے،

قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم ملکوں کا تفاوت، اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں کا فرق ہے، وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہموطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خودغرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی، اور اپنی زبون حالی کا احساس اور قوی ہو گیا، تاہم جب اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روحِ مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوتا اور دلِ بیتاب سے جوشِ سرور کی جو موجیں اُٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ کو رسمِ سلاملق کا دلفروز سمان اور عید کے موقع پر موکبِ سلطانی کا پُرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولنا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی، مولنا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکبِ سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے، جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا ساغر ہے، اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے،

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس   خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

تندئے بود خسرا ہم ہنوز — دیدۂ من باز و بخوا بم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی، کیا محض اس لئے کہ دولت وثروت اور جاہ واقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کردیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس جاہ وحشم کے آئینہ میں اُن کو اسلام کی حیات ملی کا تابناک چہرہ نظر آرہا تھا، عیدگاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے، فرماتے ہیں:۔

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید — مہر جہاں تابِ خلافت دمید

قاعدۂ دولت و دیں را مدار — آئینۂ رحمتِ پروردگار

شاہ فلک کوکبہ عبدالحمید — ایدک اللہ بنصرٍ مزید

فرۂ شاہی بہ جبین آشکار — حاشیہ بوساں بہ یمین ویسار

آگے چل کر دعائیہ اشعار میں اُن کے جذبات اور نمایاں ہو جاتے ہیں:

جز تو کہ ہست ای شہِ انجم سپاہ — آنکہ بود شرعِ نبی را پناہ

تازگیِ بدر و حنین از تو ہست — زیب و طرازِ حرمین از تو ہست

چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است — زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی، نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی، بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بےساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر گیا ہے،

رسمِ سلاملق دیکھنے کے بعد مولنا پر جو کیفیت طاری تھا اس کی تصویر ان کے سفرنامہ سے زیادہ ان کے ایک مکتوب میں ہے، جو مکاتیب میں شامل ہے، یہ خط چونکہ عین اسی دن لکھا گیا ہے اس لئے

اس سے اُن کے تاثر کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹ جون ۱۸۹۲ء کے خط میں اپنے والد ماجد کو لکھتے ہیں،

قبلہ ام!

آج میں نے "عجیب دلآویز" خواب دیکھا ہے، "عجیب" اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور "دلآویزی" کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے، مفصل سنئے، آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا، جامعۂ حمیدیہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گذرگاہِ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے،

محلِ سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نہایت پُر تکلف جامع مسجد ہے جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے، اس گذرگاہ میں ایک مکان ہے، اور دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار جو موکبِ ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں اور اُس مکان کی چھت پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیونکہ سواری کے وقت دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے، اور کوئی شخص اُس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا، حسین حبیب[1] آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مجھ کو اجازت

[1] جنگِ روم و روس میں مولانا نے چندے انہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ بھیجے تھے، یہی ذریعۂ تعارف تھا،

دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے، اُدھر سواری کا وقت قریب آگیا اور طرقوا
اور دور باش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا، اور صفِ اول مین
جاکر بیٹھا، سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصّہ پر جہاں
نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہین جاسکتا تشریف لے جاتے ہیں، وہاں
ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے منبر کے بائیں طرف ہے، یہ سلطان کی نماز کی جگہ ہے،
جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اور کوئی شخص اُن کو
دیکھ نہیں سکتا، خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھاکر بڑے جوش سے یہ کہا کہ
اَللّٰھُمَّ انصر مولانا السلطان السلطان الغازی عبد الحمید خان تو میرے بے اختیار
آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے
صحابہؓ کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ آج ظلِ اللہ
ہیں تاہم ان کا رتبہ حضرت صدیق و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، نماز کے
بعد حسین حبیب آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سرداران
فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے لے جاکر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے
سلطان مقصورہ سے اُتر کر زینہ کے قریب پردہ کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے
گذرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹہ کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا، قریباً دس ہزار فوج تھی، مختلف
رسالے، اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے، میں کیا کہوں، ترکی جوانوں کی دلیرانہ
صورتیں، چمکتے ہوے اسلحہ، موزوں اور باقاعدہ رفتار، گھوڑوں کی جست وخیز، پاشاؤں کا

زرکار لباس، جگمگاتے ہوئے تمغے، عجیب سماں تھا جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا، اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر نو دس برس کی ہو لیکن جس شان وشوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے، فوجیں گذر چکیں تو سلطان گاڑی پر سوار ہوئے اور ہمارے سامنے سے گذرے، سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا، سلطان دونوں ہاتھوں سے اُن کا جواب دیتے تھے، یورپ کے اکثر معزز اشخاص یہ تماشا دیکھنے آئے تھے، حالانکہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہے، عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے، خدا وہ دن بھی دکھلائے،

خدا نے یہ دن بھی اُن کو دکھایا، اس دن سلاملق نہ تھی، اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی لیکن شان وشوکت، جاہ وجلال، جوش واثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، قریباً ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا، اس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے، یکایک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں معلوم ہوا کہ تمام وزرار، پاشا، افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدہ دارانِ ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان وشوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زریں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس، تمام میدان جگمگا اٹھا، یہ صف جا چکی تو سلطان کا جمالِ جہاں آرا نظر آیا، گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتا تھا، اور ہر قدم پر اس زور سے بادشاہم چوق یشا (زندہ باد) کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا، مولنا عید کا یہ سماں دیکھ کر واپس آئے تو اُن کا دل شاعرانہ جذبات سے معمور تھا، چاہا کہ جو تماشا انھوں نے دیکھا ہو وہ دوسروں کو بھی دکھائیں، مثنوی عیدیہ کے نام سے یہ نظم اُن کے سفرنامہ اور کلیات میں درج ہی، اسی مثنوی کے وہ چند شعر ہیں جو اوپر گذر چکے

مولنا کا یہ سفر جیسا خالص علمی اور تعلیمی مقصدوں کے لئے تھا، ویسے ہی تائید غیبی نے انکی عزت افزائی کا ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس کے حصول کی کوشش کیا وہم و گمان بھی کسی غیر ملک کے آدمی کو نہیں ہو سکتا تھا، اور جس کے عطا میں اعترافِ کمال کے سوا دینے والے کی کوئی سیاسی مصلحت بھی نہیں ہو سکتی،

جنگِ روم و روس کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام اُن دنوں بچہ بچہ کی زبان پہ تھا، اور اس جنگ سے جو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہی اس لئے قسطنطنیہ پہنچ کر اس نامور ترکی سپہ سالار کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا، یہی کشش اُن کو غازی موصوف کے درِ دولت تک کھینچ لے گئی،[۱]

پہلی ملاقات کے بعد پاشائے موصوف نے مولنا سے دوسری ملاقات کی خواہش کی، مولانا نے دوسری بار اُن سے ملاقات کی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تپاک سے ملے اور کہا کہ جب یہاں سے جائیے گا تو مجھ سے مل لیجئیگا، اسی اثنا میں انھوں نے مولنا کے لئے سلطان سے "تمغہ مجیدی" کے عطا ہونے کی درخواست کی تھی اور وہ منظور بھی ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو خود اس کی خبر نہ تھی، ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنے مکان میں سو رہے تھے، کہ انکے

[۱] اس ملاقات کا ذکر حال سفرنامہ میں موجود ہے، مگر ایک واقعہ ایسا ہے جو صرف سینہ بسینہ منقول ہے، مولنا شروانی فرماتے ہیں کہ "غازی عثمان پاشا کی ملاقات کا ایک واقعہ خود مولنا نے مجھ سے بیان کیا تھا، ملاقات کے وقت جب ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں تھا، مولنا نے غازی سے درخواست کی کہ جس ہاتھ سے آپ نے کفار کو قتل کیا ہے اس کے چومنے کی اجازت مجھ کو دیجئے، پاشا نے کہا کہ آپکا ہاتھ چومنے کے قابل ہے، جس نے علمی خدمات انجام دی ہیں، اور یہ کہکر مولانا کا ہاتھ چوم لیا" ۱۲

ایک دوست دوڑے ہوے آئے اور مولنا کو جگا کر کہا "یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان"

مولنا کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا، لیکن قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو یہ خبر صحیح نکلی، دوسرے

دن تمام احباب مبارک باد دینے آئے، اور مولنا نے اس خوشی میں ایک مختصر سا جلسۂ دعوت

ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولنا عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے کہا

"تمغۂ مجیدی مبارک" پاشاے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارکباد دی، تمغہ سامنے

میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مولنا کے حوالہ کیا'

مولنا سرو قد کھڑے ہو گئے اور سلطان کو دعا دی، رخصت کے وقت پاشاے موصوف

نے مولنا کو اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی عطا ہوا جو سفرنامہ

میں نقل ہے،

اس تمغہ اور فرمان کے ملنے کی تاریخ ۱۴۔ محرم ۱۳۱۰ھ ہے، مولانا نے ہندوستان پہنچکر

اس تمغہ کو استعمال کرنا چاہا لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲۔ مئی ۱۸۸۶ء کے قانون کے مطابق

اس کی اجازت نہیں دی،

قسطنطنیہ سے روانگی قسطنطنیہ میں مولنا قریب قریب تین مہینے تک رہے، ان تین مہینوں

کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا جس کے تفصیلی حالات

سفرنامہ میں مذکور ہیں، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، اس سے فراغت ہو گئی تو یہاں سے

طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات کو جو سلطان کی تخت

نشینی کی رات ہے بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، لیکن مولنا اس کا بھی انتظار نہ کر سکے'

اور ۲۶ر محرم ۱۳۱۰ھ کو چل کھڑے ہوئے،

بیروت | ساتویں دن بیروت پہنچے اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہے، بیروت میں قیام کی اصلی وجہ شیخ طاہر مغربی کی ملاقات کا شوق تھا، یہ شیخ رہنے والے تو شمالی افریقہ کے کسی ملک کے تھے، مگر زیادہ تر یہ مصر اور شام میں رہتے تھے، یہ زندہ کتب خانہ تھے، قلمی کتابوں اور کتبخانوں کی نادر کتابوں کے نام اُن کی نوکِ زبان تھے، اُن کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتب خانہ کے نوادرات کے نام درج تھے، توجیہ النظر وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں،

بیروت خود بھی اس وقت شام میں شامی عرب عیسائیوں کی جدید علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز تھا، علمی انجمنیں، ادبی مجلسیں، اور نئے علم و فن کے کالج، اچھے اچھے عربی مطبعے قائم تھے، جن سے عربی ادب کی عمدہ عمدہ کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اور ان ہی مطبعوں سے عربی اخبار اور رسالے نکل رہے تھے، اور عربی زبان میں نئے علوم اور نئے خیالات کے لئے الفاظ بن رہے تھے، مولانا نے ان سب پر غائر نظر ڈالی اور وہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی، جس کا پورا مرقع سفرنامہ میں موجود ہے،

بیت المقدس | بیروت سے مولانا کے شامی دوست شیخ علی ظبیان اپنے والد کے اصرار سے دمشق چلے گئے، اور مولانا نے ۸۔ صفر ۱۳۱۰ھ کی شام کو بیت المقدس کی راہ لی اور وہاں پہنچکر وہاں کے ہندوستانی زاویہ میں قیام کیا، اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت، اور وہاں کے مفتیِ شہر سید طاہر اور دوسرے علماء و فضلا سے ملاقاتیں کیں، اور بعض مجلسوں

میں علمی مسائل پر گفتگو کی، یہاں سے فارغ ہو کر مصر کا رُخ کیا، اور اسکندریہ سے ریل پر بیٹھ کر قاہرہ پہنچے،

قاہرہ قاہرہ میں مولانا نے مصر کے قدیم تعلیمی مرکز جامع ازہر میں رواق الشامیین کے ایک حجرہ میں قیام کیا، اور وہاں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے، چونکہ قاہرہ قدیم وجدید دونوں قسم کی تعلیم کا مرکز ہے، اس لئے مولانا نے یہاں کے نظامِ تعلیم کو نہایت غور سے دیکھا، اور ان کو نظر آیا کہ جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے، اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے،

مولانا کو صرف ایک کالج جس کا نام دار العلوم تھا نظر آیا جو مولانا کے خیال میں دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا تھا، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پوری طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا، دار العلوم کے علاوہ مولانا نے متعدد مدرسے اور کالج مثلاً مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترجمہ، مدرسۃ الطب وغیرہ دیکھے اور اُن کے متعلق مفید و مستند معلومات حاصل کیں،

مصر میں سب سے زیادہ مولانا کی دلچسپی کی جو چیز تھی وہ جامع ازہر تھا، مولانا نے اسی میں قیام کیا تھا، لیکن دورانِ قیام میں وہ جس نتیجہ پر پہنچے اس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے، "مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد ۱۲ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے، اور کرتا جاتا ہے، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت، غرض

تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں، جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں اس لئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دنارت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ بحق سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت وشان بڑھائیں گے، ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر اُن سے بھی گیا گذرا ہی، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے، اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں، منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علومِ عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث، ادب معانی و بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلم کے کسی طرح شایان نہیں"۔ مدارس کے ساتھ مولانا کا ایک بڑا مطمحِ نظر کتب خانے تھے، مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ، کتبخانۂ خدیویہ تھا جو اب کتبخانۂ مصریہ کہلاتا ہے، مولانا نے اس کو جا کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ "ترتیب وخوش اسلوبی، زیب وزینت حسنِ انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے"۔ اس وقت اس کتب خانہ میں ہر علم وفن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود تھیں (اب تو اس کی تعداد اس سے دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے) مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا، اور ہر علم وفن کے نوادر کتب کی ایک فہرست مرتب کی، جو ان کے سفرنامہ میں موجود ہی، تاریخ اور ادب کی جن نادر کتابوں کو مولانا نے اس وقت چنا تھا، ان میں سے اکثر آج کل چھپ چکی ہیں، البتہ تفسیر

اور حدیث کی جن کتابوں کے نام لئے ہیں ان میں سے اکثر اب تک غیر مطبوعہ ہیں،

مدارس اور کتب خانوں کے ساتھ مولانا نے مطابع، اخبارات، انجمن، کلب اور مصر کے عجائبات وغیرہ دیکھے، مصر میں قدیم وجدید تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی اور دونوں تعلیم کے اکابر وہاں موجود تھے، مولٰنا نے اس موقع کو غنیمت جان کر دونوں سے ملے، نئے تعلیم یافتوں میں سے علی پاشا مبارک، علی پاشا ابراہیم، امین بک فکری، اور احمد زکی سے اور پرانے تعلیم یافتوں میں سے شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہ سے خاص طور پر ملے، اور اُن سے عربی تعلیم اور عربی مدارس کے نظام پر گفتگو کی،

مصر میں عربی زبان پر جو نئے انقلابات آئے، اور نئے خیالات، نئی چیزوں، اور نئی باتوں کے لئے جو نئے عربی لفظ بن گئے تھے یہاں مولٰنا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا، اور غالبًا ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہِ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی، مولٰنا نے اپنے سفرنامہ کے آخر میں بہت سے نئے الفاظ کی فہرست شامل کر دی ہے،

صحت پر عمدہ اثر مولٰنا کے اس سفر کی ایک ضمنی غرض صحت کی بحالی تھی، بحمداللہ کہ اس سفر میں یہ غرض بھی پوری ہوئی، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے، ایسی تندرستی پھر اُن کو نصیب نہیں ہوئی[1]،

واپسی اور سفر کے تاثرات اور نتائج مولٰنا کا یہ علمی سفر مصر میں تمام ہو گیا، وہ وہاں سے سیدھے ہندوستان تشریف لائے، اخیر اپریل ۱۸۹۲ء سے ان کا سفر شروع ہوا تھا، اور اسی

[1] مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ، ۱ر جنوری ۱۹۱۵ء

سال کے شروع نومبر میں ختم ہوا، ان چھ مہینوں میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز حصوں کو دیکھکر جن کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، مولانا کے حساس دل کو اسلام کی گذشتہ علمی یادگاروں کو دیکھ کر جہاں مسرت ہوئی وہیں مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو دیکھ کر اُن کو بڑا رنج ہوا، قسطنطنیہ ہی میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر مولانا نے اپنے والد ماجد کو لکھا: "اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی وقوت کی نسبت بالکل برباد ہوگئی ہیں، کیونکہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں، تاہم سفر بے شبہہ ضروری تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا، افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہو جاتی ہے"

ان فقروں سے اندازہ ہوگا کہ کیا چیز اُن کو ہندوستان سے کھینچ کر اس بحر و بر اور دشت و جبل میں لے گئی تھی، اُن کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی، اور طریقۂ تربیت اور درسگاہوں کا ماحول تمامتر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درسگاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اُس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پہ رہیں، اور نصاب میں متاخرین کی شروح وحواشی کے بدلے قدماء کی اصلی کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں، درسگاہیں عالیشان، رہنے کے کمرے صاف ستھرے، اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو، لیکن یہ چیز اُن کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں، سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی...... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا، کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں (حاشیہ) نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھکر سخت رنج ہوتا تھا"

مولانا کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام و دستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (مسودہ) جس کو سیاحِ روم و شام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے، اُس کو نظر آئے گا کہ روم و شام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے اپنے سفرنامہ کے شروع میں اپنے اس سفر پر خود تبصرہ کیا ہے، جس سے بہتر تبصرہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا، فرماتے ہیں:- "ٹرکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے، اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں، ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے

کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہی، جو شخص جس حال میں ہے اسی پر قانع ہی، موجودہ حالت تو یہ ہے وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

کالج میں خیر مقدم | کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا۔ اس لئے جب مولنا ہندوستان واپس آکر کالج میں پہنچے تو واپسی سفر کی مبارکباد میں متعدد جلسے منعقد ہوئے، سب سے پہلے ۱۲۔ نومبر ۱۸۹۲ء کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک دعوت دی گئی جس میں سر سیّد اور کالج کے پروفیسر بھی شریک تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے ایک مختصر تقریر میں مولنا کے دور دراز سفر سے بخیریت واپس آنے کا شکرانہ ادا کیا، اور مولنا کے علوے ہمت اور سفر کی تکالیف کی ہنسی خوشی برداشت کی تعریف کی، اور ان کے اُن احسانات کا ذکر کیا جو ان کی تحقیقاتِ علمی سے قوم اور قومی کالج کے لئے متصور تھے، اور آخر میں مولنا کو "تمغۂ مجیدی" ملنے پر مبارکباد دی، ان کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو ان دنوں وہاں فورتھ ایر کلاس میں پڑھ رہے تھے، مندرجۂ ذیل نظم پڑھی،

باز وقتِ گرمیِ بزمِ سخن آید ہمی — بلبلِ گم گشتہ در صحنِ چمن آید ہمی
زینتِ ہر بزم و زیبِ انجمن آید ہمی — آں ادیب و شاعر و ہسٹورین آید ہمی
مورخ

واپس آئے سیرِ روم و شام و مصر و زنگ سے — آشیاں، بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیئے — تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیئے
پنجۂ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیئے — ایک فقرے سے ہمیں ڈھارس بندھا کر چل دیئے
ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم — خانہ بر موجِ سمندر چوں حباب انداختم

کذا

اس کے بعد ۶۔ دسمبر ۱۸۹۲ء کو کالج اسٹاف کی طرف سے مولٰنا کو ایک شاندار ڈنر دیا گیا جس میں مولٰنا نے ایک ترکیب بند پڑھا، جس کے چند اشعار یہ ہیں :۔

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد	کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج بہ رسید	یا مگر بلبلِ شیراز بشیراز آمد
دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ و گو	اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد
رفت ہر چند بسے بے سر و ساماں اما	شکرِ ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد

پورہ قصیدہ کلیات میں موجود ہے،

سفرنامہ کلیات اور رسائل

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک

سفرنامہ — اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کا تقاضا ہوا کہ سفر کی سوغات لایئے، یعنی سفرنامہ لکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے دورانِ سفر میں تو مولٰنا کو یہ خیال تھا کہ وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دینگے چنانچہ ۲۵۔ مئی ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں :۔ "حالات دلچسپ ہیں اور سفرنامہ کے لئے بہت سامان مل جائے گا" (سرسید۔۱) لیکن واپسی کے بعد مولانا نے احباب کے اصرار کے باوجود اس خیال کو ترک کر دیا، ۲۴ ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں :۔ "سفرنامہ کے لئے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہو گئی ہے، لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے، جس کے متعدد اسباب ہیں" (اسحاق۔۴) مولانا نے ان اسباب کی تشریح نہیں کی، لیکن

ان متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب کا ذکر سفرنامہ کے شروع میں کیا ہی، یعنی یہ کہ سفرنامہ کے لئے جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے اُن میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں، اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہی، وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہی اُن کی دعوت میں یہ ماحضر پیش ہی،

لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا اس پر اب بھی پردہ پڑا ہے، واقعہ یہ ہی کہ ۱۸۷۷ء کی جنگِ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی ٹرکی کے ساتھ بڑھ رہی تھی، حالانکہ اس جنگ میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا، اور ان ہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ٹرکی کے لئے چندے کئے تھے، اور بڑا جوش پھیلا تھا، پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ٹرکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی، مگر کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی، اس کامیابی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تمام ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی گئی، جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منھ چڑھایا گیا، اسی لئے سرسید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے، اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا، اور

اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ٹرکی کی یہ عقیدت جاتی رہے، اور اتحاد اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کمزور پڑ جائے،

مولانا کا ٹرکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ہندوستان اور ٹرکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی، اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے، جو ٹرکی گئے،

قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اپنے جوش وخروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلیونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے، اور وہاں سے "تمغہ مجیدی" کا تحفہ ہندوستان لائے، اس واقعہ نے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے ارباب بست وکشاد کو چراغ پا کر دیا، آپ جب مولانا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے سیاسی مصلحت شناسوں کے حلقہ میں یہ سمجھا گیا، کہ معلوم نہیں اس سفرنامہ میں کیا کیا زہر ہو اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی کیسا پڑے،

بہرحال جب یہ طے ہوگیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہیگا کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی، اور وہ لکھا گیا، ۲۶-مارچ ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں: "میں آج کل سفرنامہ لکھ رہا ہوں"۔ (سمیع ۳۴) اسی لئے یہ سفرنامہ خالص علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا، پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ٹرکی کی محبت کا نیا بیج نہیں بو دیا، اور اسی لئے انگریزوں نے مولانا نے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا، جس کی تفصیل آگے کہیں آئیگی،

مولٰنا کو خیال تھا کہ اس مادہ کے سفرنامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی، اسی لئے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہہ تھا، ۱۱ اپریل سنہ ۹۲ء کو لکھتے ہیں:۔ "معلوم نہیں اس سفرنامہ سے ملک کو کہاں تک دلچسپی ہوگی، اس کا اندازہ ہوتا تو اسی حساب سے جلدیں چھپتیں" اب تک مولٰنا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں، مگر یہ سفرنامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شاید اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا، اس کا پہلا اڈیشن مفید عام آگرہ میں جو اس زمانہ کا اچھا مطبع تھا سنہ ۹۴ء میں چھپا، مہدی افادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں، ۲۷ اکتوبر سنہ ۹۴ء کو لکھتے ہیں:۔ "سفرنامہ میرے ہاں سو ملتا ہی، مگر میں آج سفر میں تھا، اب علی گڈہ پہنچا ہوں لیکن سردست اس کی جلدیں یہاں نہیں رہیں، آگرہ کو لکھا ہی، جس وقت کتابیں آئیں گی، فوراً تعمیل ارشاد ہوگی، آپ تار وار نہ بھیجیں" (مہدی افادی -۶) یہی وہ کتاب ہی جس سے کالج اور مولٰنا کی تصنیفات میں ھٰذا فراق بینی و بینک کا اصول جاری ہوا، اور ع من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی کی پرانی شریعت منسوخ ہوئی،

ک / سمیع ۲۵

کلیات فارسی سنہ ۹۳ء | ابھی اس زمانہ کو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے، جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہل ذوق کے سلسلۂ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوتی تھی، اسی لئے مولٰنا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کرنے کا خیال بہت دنوں سے تھا، مگر چونکہ طبیعت میں ابھی جھجھک باقی تھی اس لئے چاہا کہ سارا کلام استاد کی نظر سے گذر جائے، کالج میں جانے کے دوسرے ہی سال، ۲۷ مارچ سنہ ۸۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھا:۔ "میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا اس واسطے اگر آپ اسے دیکھ لیں تو بہتر ہے، حضرت موصوف نے منظور

فرما لیا ہے، میرے پاس جو کلام ہو وہ میں بھیجدوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمھارے پاس ہیں، نہایت جلد مولنا کے پاس اس نشان سے بھیجدو، بلیا، عدالت منصفی" مولنا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولنا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی اور وہ وہاں سے غائب ہو گئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم عرشی مرحوم پر شبہہ تھا جو بعد کو حیدر آباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے تھے، اور جوانی ہی میں وفات پائی، لوگ کہتے تھے کہ وہ ان ہی نظموں کو حیدر آباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے[1]،

پھر اسی قسم کا واقعہ ۱۸۸۷ء میں پیش آیا، اور کسی نے مولانا کی بیاض کے آدھے حصہ پر ڈاکہ ڈالا، ۱۷ جولائی ۱۸۸۷ء کو ایک عزیز کو لکھتے ہیں:" میری بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا، نہایت افسوس ہے" (سمیع ۲۴) مولنا نے کالج میں اگر چہ قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفر روم میں جو نظمیں لکھیں اس نے فارسی کے اہلِ ذوق میں آگ سی لگادی، اردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولنا حالی نے ڈالی ہو یا شمس العلماء آزاد نے، مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلا شبہہ مولنا شبلی نے ڈالی، اور اُس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی، مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آبحیات بن گئی،

[1] یہ روایت میں نے جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب (برادر نسبتی نواب سید علی حسن خان) سے سُنی جو مولنا کے پرانے دوست ہیں،

مولنا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی کے شاعر، اور اس زبان کے جوہری تھے، مولنا کو لکھا کہ "وہ ان انمول موتیوں کا ہار اہلِ نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں، یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں"۔ مولنا نے یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس خط کا برا مانا اور ان کو لکھا کہ "ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے" نواب صاحب نے دوبارہ لکھا کہ مقصود یہ نہیں ہی، بلکہ آپ کی متفرق نظموں کے جمع اور طبع کرنے کی تحریک کرتا ہوں[1]، مولنا نے ان کی اس تجویز کو پسند کیا، نواب صاحب نے ان کے کلام کا جو حصّہ جمع کیا تھا ان کے پاس بھیج دیا، کچھ اخباروں سے جمع ہوا، اپنے وطن میں ایک عزیز شاگرد کو ۲۶۔ مارچ ۱۸۹۳ء کو یہ لکھا:۔ "میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لئے گیا، اور امید ہی کہ جلد تیار ہو جائے، اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا اشعار جمع کئے گئے، جس کے محرک بلکہ جامع نواب سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں مرحوم ہیں،

میاں حمید کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسہ کے لئے ایک نظم لکھی تھی "آمدہ" اس کی ردیف ہے اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیجدو تو وہ بھی چھپ جائے، تمہارے ذریعہ سے اگر اس مجموعہ میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو تو اٹھا نہ رکھو، لیکن اس کے ساتھ جلدی شرط ہی، کیونکہ عید تک چھپکر شائع ہو جانا مقصود ہی" (سمیع ۴۴) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سے کچھ سرمایہ نہیں نکلا، آمدہ والی نظم بھی دیوان میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی نہ مل سکی، حمید مرحوم اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ولایت گئے تھے اسی لئے اسی زمانہ میں یہ نظم کہی گئی تھی[2]،

---

[1] بروایت جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب [2] اس نظم کے دو شعر حمید مرحوم کی تعلیم کے سلسلہ میں

معلوم ہوتا ہے کہ مولنا نے قصدًا اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا، اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لئے جو ان کے انتخاب میں آئے، جیسا کہ دیوان کے حصۂ تشبیب و غزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ "چہ کنم" والی غزل کے بھی دو ہی اشعر لئے، اور نہ خود انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں اس میں جگہ پا سکیں جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ مدحیہ نظمیں جو صرف کالج کے خیال سے بعض امراء کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں، وہ چونکہ طبعِ غیور پر بار تھیں، اس لئے اُن کو بقاے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا،

بہرحال اس قطع و برید کے بعد ایک مختصر سا "مجموعۂ نظم شبلی" مرتب ہوا، اور منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس سے جو اُن دنوں اپنی صفائی اور چھپائی کے حسن و خوبی میں ممتاز تھا، بڑے اہتمام سے چھپا اور اہلِ ذوق میں مقبول ہوا،

رسائل شبلی ۱۸۹۲ء سے لیکر ۱۹۰۵ء تک مولنا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے اور ملک کے مشہور رسالوں میں چھپے، یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے متعلق تھے، ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا گیا ہے، جو یورپین تعصب کی آندھی نے اُس پر ڈالا تھا، اور یا مسلمانوں کے عہد زرّیں کے مرقع کی کوئی پرانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) اوپر لکھے گئے ہیں،

خار در دیدۂ عدو شکنی — حاسداں را جگر گداز آئی

ما بہ نادیدہ در رہت باشیم — کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

عجب نہیں کہ اسی نظم کے چند اشعار کو خفیف رد و بدل کے ساتھ عطیہ فیضی بیگم کے سفرِ یورپ کے موقع پر ان کو لکھ کر بھیجے تھے جو خطوطِ شبلی میں موجود ہیں،

تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، دوبارہ منظرِ عام پر لائی گئی ہی،

یورپ نے تمام علمی دنیا میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انھوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتبخانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے وہاں قائم تھا جلا کر خاک کر دیا، اور دنیا گذشتہ انسانی دماغوں کے معلومات سے محروم ہو گئی، مولانا نے اس کی تردید میں ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا، اور مسلمانوں کی فتحِ مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، اس لئے یہ مسلمانوں پر سراسر افترا ہی، اور اس افترا کا بانی چھٹی صدی ہجری کا ایک عیسائی مورخ ابو الفرج ملطی ہی، اس مضمون کے ساتھ مسٹر کریل وغیرہ بعض یوروپین مستشرقوں کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے، جن میں مسلمانوں کے سر سے اس الزام کی تردید کی گئی تھی، یہ مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا، کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا، اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا،

مولانا کے اس مضمون کے بعد سے خود یورپ کے عیسائی فاضلوں نے اس الزام کی تردید میں بہت سے فاضلانہ مضامین لکھے ہیں، جن میں اکثر کے ترجمے الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڈھ، اردو حیدرآباد وغیرہ میں شائع ہو چکے، اور اب کوئی لکھا پڑھا آدمی اس الزام کو نہیں دُہراتا،

اسی سال ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور علمی رسالہ "حسن" میں اسلامی کتبخانوں کی تاریخ پر مولانا کا محققانہ مضمون شائع ہوا، اور معلوم ہوا کہ دنیا کے کس کس حصہ میں مسلمانوں

نے علم وفن کی کتنی دولت جمع کی تھی، رسالہ کے دستور کے مطابق مولنا کو اس مضمون پر ایک اشرفی انعام ملی،

۱۸۹۴ء میں علی گڈھ میگزین کی اڈیٹری کی ذمہ داری جو مولنا کے سر ڈالی گئی، اُس سے مجبور ہو کر بھی مولنا کو اس زمانہ میں متعدد مضامین لکھنے پڑے جن میں ایک اسلامی حکومتین اور شفاخانہ" والا مضمون ہے، جو جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں چھپا، اور اسلامی سلطنتوں کے تمدنی شعبوں کے سلسلہ کا ایک حلقہ بنا،

مسلمان بادشاہوں پر بڑا الزام تھا، کہ انھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ کا ظالمانہ ٹیکس لگا کر بڑی توہین کی، ہندوستان کی تاریخوں میں بھی اس کو بار بار دہرایا گیا ہی، تا کہ ہندوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بیٹھ جائے، مولنا نے رسالہ" الجزیہ" لکھ کر اس خوبی سے اس کی حقیقت واضح کی کہ علمی دنیا پر اس تحقیق سے حیرت چھا گئی، سر سید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا، اور خود مولنا نے اپنے قلم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس طرح مشرق و مغرب دنیا کے دونوں حصوں میں یہ آواز پھیل گئی، یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے،

۱۸۹۶ء کے شروع میں ٹرکی کے صوبہ آرمینیا میں بغاوت ہوئی، تو ترکوں نے اس کو بزور دبایا اس پر یورپ کے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ اسلام نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا پر ایسا ہی ظلم کیا ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں مسئلہ آرمینیا پر ایک سیاسی مضمون ۲۱- فروری ۱۸۹۶ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں چھپوایا، جس میں ترکوں کے عدل و انصاف

اور آرمینیا کے مسٔلہ کی حقیقت ظاہر کی، ساتھ ہی اس عنوان پر کہ "اسلام کے قانون میں ذمی (غیر مسلم) رعایا کے کیا حقوق ہیں"۔ ایک نہایت مفصل مضمون لکھا، جو علی گڑھ میگزین کے مارچ اور اپریل ۱۸۹۶ء کے پرچوں میں چھپا، اور شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا،

الغرض ۱۸۹۷ء تک اس قسم کے اہم مضامین کا ایک مجموعہ فراہم ہوا، اور رسائل شبلی کے نام سے ملک میں شائع ہوا، مولانا کے قلم سے یکم فروری ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا مقدمہ اس میں لگا ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے کا کیا باعث ہوا، فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اُس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے، اگرچہ اس مقصد کے لئے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا، لیکن چونکہ قوم کو حوصلہ اور غیرت دلانے کے لئے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا "کہ تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں کئے تھے، تم کو بھی اُن ہی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے"۔ اس لئے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ ان کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ اُن پر فخر و اقعات کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی، یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتداء ہوئی اور بعض بعض اہلِ قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے، لیکن چونکہ یہ اُن کا اصلی کام نہ تھا اس لئے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا،

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں، اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کے ترجمے کئے، نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کئے،

یہ رسالہ اگرچہ ناتمام تھا یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چونکہ ہماری زبان مین اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہین مہیا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا، اور یونانی تراجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں،

قبولِ عام کی بنار پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم مین تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہوگیا ہے، جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہی لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخواں فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے، خواہ مخواہ اس کو قبول ہوجاتا ہی،

اسی کا نتیجہ ہی کہ باوجود اس شور وغل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہی، تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سینکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کئے گئے، اور کئے جاتے ہیں، نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا،

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کردیا تھا، لیکن یورپ میں جو اورنیٹل کانفرنس قائم ہی، اس کی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی وعملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے، چنانچہ پہلے سال جو اس کا اجلاس ہوا، اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم ادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے، کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے کہ "مسلمانوں نے خاص علم طب

کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں۔" یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں وہ دراصل ہمارا کام ہے، اور یہ ایک بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں، اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے۔"

مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے "تمدنِ اسلامی" کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے، اور اُن ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) اُس نے یہ مرقع تیار کیا ہے،

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے ۱۸۹۳ء

مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ المامون کے بعد ہی کیا تھا، بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا، اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی، لیکن تاریخ طبری جو اس کے لئے بہت ضروری کتاب تھی وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ دنوں کے لئے رُک جانا پڑا، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی، وہ رقم طراز ہیں:-

"المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔"

کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید اس بیان میں مولانا نے کرنی چاہی ہو، اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی، اور وہ کالج کی وہی مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سُنّی اور شیعی کا فرق پیدا کر دے، اُس زمانہ میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کا تھا، سرسیّد کا خیال تھا کہ چونکہ وہ شیعہ ہیں، اس لئے یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب ہوگی، یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں ہو پایا تھا، لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس لئے وہ اس مصلحت پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے پیش کر دیا جائے، چنانچہ سرسیّد نے اُن کو خط لکھا، ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا یہ آیا کہ "اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حیف ہو کہ اس کی سوانحعمری بھی نہ لکھی جائے"۔ اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف و تحسین[له] بھی کی،

اتفاق سے سرسیّد کے خطوط میں نواب عماد الملک کے نام ایک خط مل گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا، اس سے زیادہ خود سرسید ہی کو تھا، یہ خط کافی بڑا ہے، مگر پڑھنے کے لائق ہے، یہ خط ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کا ہے

له اس کی تائید مولانا شروانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں: -"مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو، انھوں نے جواب میں لکھا کہ اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہی، لہذا انکی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو نہ روکئے" سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے، یہ واقعہ خود سرسیّد نے مجھ سے بیان کیا تھا،

"شروانی"

ابتدائی تمہید کے بعد ہے،

"جناب مولوی شبلی صاحب کی نسبت جو فقرہ آپ نے تحریر فرمایا تھا، وہ میں نے ان کو سنایا، ان پر چار حالتیں گذریں، جب تک میں پڑھتا رہا حیرت میں رہے اور تردد رہا کہ درحقیقت یہی الفاظ لکھے ہیں، پھر میں نے ان کو وہ خط دیا کہ اس فقرہ کو وہ خود پڑھ لیں، جب کہ انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی الفاظ ہیں تو ان کو ندامت اور افتخار اور مسرت تین حالتیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں، ندامت تو اس لئے تھی کہ وہ اپنے نزدیک اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھتے جس طرح ان کی نسبت آپ نے اپنے خیالات ظاہر فرمائے، افتخار اس لئے تھا کہ آپ جیسے شخص نے ان کی تصنیفات کی اس قدر قدر فرمائی، اور درحقیقت ان کا یہ فخر ناواجب نہ تھا، فلاں وبہماں کی واہ واہ سے نہ ان کا دل خوش ہو سکتا اور نہ کچھ فخر ہو سکتا تھا، بلاشبہہ آپ کی قدر دانی باعثِ افتخار ہو سکتی ہے، مسرت ان کو بے انتہا اس لئے ہوئی ہو کہ چونکہ وہ آپ کی نیک طبیعت اور مزاج سے واقف نہ تھے ان کو دل میں افسوس تھا کہ آپ ان کی پہلی تحریرات سے کسی قدر آزردہ خاطر ہیں، دفعتًہ ان کا وہ خیال زائل ہوگیا، اور بے انتہا مسرت ان کو ہوئی، میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا، کیونکہ اس وقت جو میرے دل میں آیا اسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا، میں نے کہا تم سید حسین کو نہیں جانتے، میں نے آجتک ان کا سا نیک دل اور پاک باطن، ظاہر و باطن حاضر و غائب یکساں سچا دوست اور ہمہ تن سچائی کسی کو نہیں دیکھا، رنج و کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی پیدا نہیں کی، . . . . الفاروق کی نسبت جو آپنے تحریر فرمایا وہ سب درست ہی، مگر اس کے ساتھ فیہ ما فیہ بھی ہے، اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ ما فیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے تو بلاشبہہ نہایت عمدہ بات ہی، مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے، اگر نہ کریں گے تو کتاب ردّی ہوگی، یہی حال المعلی کا ہے، خلافت کی

نسبت بہ حیثیت انتظام ملکی کیا لکھا جاوے، اور کون لکھ سکتا ہے، میں توان صفات کو جو ذات نبویؐ میں جمع تھیں دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں، ایک سلطنت اور ایک قدوسیت، اوّل کی خلافت حضرت عمرؓ کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علیؓ و ائمۂ اہل بیت کو، مگر یہ کہدینا تو آسان ہی، مگر کس کو جرأت ہی کہ اس کو لکھے، حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا، حضرت ابوبکرؓ تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہی، جو ہوا سو ہوا، جو گذرا سو گذرا۔"

ان باتوں کے باوجود الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ دیکھکر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجۂ تام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں "سیرۃ الفاروق" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بازار میں پیش کردی، الفاروق کے مشتاقوں کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدنیتی پر محمول کیا، اس موقع پر سرسید نے علی گڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہی جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کردی ہے، "اس میں کچھ شبہہ نہیں ہی کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے

یہ کہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا، جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان اجرہ الا علی اللہ، بایں ہمہ انھوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا الذین لا ینظرون الی الدنیا وحطامھا بل ینظرون الی رحمۃ اللہ وبرکاتھا اولی حالۃ القوم واصلاحھا، کوئی ذاتی فائدہ اُن کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا، بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دیدیا، اور جب اُن کی حالتِ معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی باوقعت ہو جاتی ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بہ لحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقۂ ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے نہ ہر ایک شخص کا کام ہے، اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اُس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی،

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہے کہ انکی لائف اس طرح پر لکھی جاوے جو انسانوں کے لئے باعثِ رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعثِ آفت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی و شیعہ کو بجز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو،

سب سے مقدم یہ بات ہے کہ اوّل اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے، اور سچا ہسٹورین بنکر ان کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ فیہ ہیں، مطلق نہ چھیڑے، اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت اور انتظامی قوت کو اور اس برکت

کو لکھے جوان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا،

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہو کہ اُس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جا سکے، یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے، جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، لائف لکھی جاوے، پس حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب کہ ان کی نسبت کوئی الزام بدنیتی کا دیا جاتا ہے، منشی سراج الدین احمد صاحب ایک نیک آدمی ہیں، قومی بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں، بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی جو کام ان کو نہ کرنا چاہئے تھا انھوں نے کیا بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بدنیتی یا طمعِ نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اسی مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہونگی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا، اور یہ صادق آوے گا "فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ" یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بیدل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہو، اگر اہلِ ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہو گی، بس ان کو کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہو،

مگر ہم مولوی شبلی کی اس راے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی

لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اُن سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام" اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد "الغزالی" یعنی لائف امام غزالی کی لکھدیں، جو نہایت دلچسپ اور بیحد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں، لیکن اگر اس کے بعد بھی انھوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے"۔

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے باوجود مولانا اپنے عزم سے باز نہ آئے، ۱۱ر اپریل ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:- "الفاروق انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا لیکن وقت کی تعیین نہیں کر سکتا" (جمیع ۳۵)

آخر اگست ۱۸۹۴ء کو مصنف نے اس کتاب کے لکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیا، مولانا نے یہ واقعات الفاروق کے دیباچہ میں لکھے ہیں: "الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اوّل اوّل اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آگیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک **الفاروق** کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا،

ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رُک گیا، اور اس کے بجائے دوسرے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، لیکن جو نگاہیں فاروقِ اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں اُن کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی، سوء اتفاق یہ کہ الفاروق کی طرف بیدلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ

اٹھایا تھا، لیکن ملک کی طرف سے تقاضے کی صدائیں رہ رہ کر اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ میں مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ رکھ کر اٹھا لیتا تھا، بالآخر ۱۸؍ اگست سنہ ۱۸۹۴ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے اس کام کو شروع کیا، ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع وقتاً فوقتاً اب بھی سدِّ راہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی کئی مہینے کا ناغہ پیش آگیا، لیکن چونکہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا، اس لئے کچھ نہ کچھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا،

شکر کہ جمّازہ بہ منزل رسید   زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید

شمس العلماء کا خطاب جنوری سنہ ۱۸۹۴ء

مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا، اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرۂ روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحاد اسلامی کے مبلّغ اور سلطانِ روم کے سفیر بنکر ہندوستان آئے ہیں اس لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطانِ روم کے اس فرضی سفیر کو ممنونِ منّت بنایا جائے، اس کے لئے ابتدا خود سر سیّد کی طرف سے ہوئی، ڈپٹی سیّد زین الدین صاحب (علی گڈہ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سر سیّد نے اُن ہی سے انگریزی مین ایک چھٹی لکھوا کر گورنمنٹ مین بھیجی کہ مولنا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغۂ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہو کہ اس فرض سے غافل رہے

اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا اعلان کیا، مولانا کو شمس العلماء کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا، جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا، لیکن چونکہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا، اور سرسید کے رفقاء میں اس خطاب کی پہلی نظیر تھی[1]، اس لئے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا، اس وقت تک یہ خطاب نااہلوں کو نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی، پھر مولانا کو جس سن وسال میں یہ خطاب ملا یعنی چھتیس سینتیس سال کی عمر میں اُن کے پیشرؤں اور ہمعصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا، اور اس لئے تبریک وتہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے، جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں، معززین نے مختلف گوشوں سے مبارکباد کے تار اور خط بھیجے، اور اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے،

کالج میں اخوان الصفا اور انجمن الادب دو علمی مجلسیں تھیں، اور مولانا ان دونوں کے رکن رکین تھے، اس لئے ان دونوں نے مل کر ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اکابر سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ (سکریٹری اخوان الصفا) اور (جسٹس) سید کرامت حسین جو اس وقت وہاں قانون کے پروفیسر اور مجلس اخوان الصفا کے رکن، اور انجمن الادب کے صدر تھے، شریک تھے، حاضرین کی متفقہ خواہش سے نواب محسن الملک اس جلسہ[2] کے صدر قرار دیئے گئے، اور انھوں نے

---

[1] مولانا نذیر احمد صاحب کو یہ خطاب ۱۸۹۷ء میں اور مولانا حالی کو اس سے بھی بہت بعد ملا، [2] اس جلسہ کی یہ پوری روداد اس زمانہ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، اسی سے ہم نے نقل کی ہے،

کھڑے ہو کر حسب ذیل تقریر کی،

"جناب سرسید و سید محمود صاحب، و حاضرین! جو خوشی اس وقت اس جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوئی، اس کا اظہار مشکل ہے، صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا، خود ایک ایسی دلخوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی، پھر جبکہ وہ ایسے مقصود کے لئے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے، اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے اس پر مبارک باد دینے کے لئے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے،

صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، میں اگرچہ بظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں، مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں، اور اس لئے میں اس وقت اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھ کر اپنے اور عزیز طالبعلموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں، اے میرے عزیزو! طالب علم کے لئے ضرور نہیں کہ وہ نوعمر اور نوجوان ہو، نہ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لئے حاضر ہوتا ہو، بلکہ طالب علم وہ ہے جسے علم کا شوق ہو، اور جو علم کا طالب ہو، پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں، بلکہ جس قدر میری عمر زیادہ ہے، اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھ کر ہوں، اس لئے میں تمہارے فرقہ میں داخل ہوں، مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعویٰ کو تسلیم کرو گے، اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کرو گے، اے میرے